مُغل شہزادیاں

مصنّف

محمود علی

مغل شہزادیاں

بیاد
مرحومہ والدہ صاحبہ

اکیسویں صدی
کی
خاتون کے
نام

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

مصنّف
محمود علی سابق پرنسپل

نام کتاب ——— مغل شہزادیاں

مصنف وناشر ——— محمود علی

اشاعت ——— جنوری ۲۰۰۰ء (تعداد ۵۰۰)

طباعت ——— شوبی آفسیٹ پریس، دریا گنج، دہلی

کتابت ——— حافظ وسیم احمد

قیمت ——— تین سو چالیس (۳۴۰) روپے۔ انتالیس (۳۹$) ڈالر

تقسیم کار ——— ایبٹ کمپیوٹرس ۲۶۵۲/۵۵ کوچہ چیلان
دریا گنج نئی دہلی ۲

ملنے کا پتہ ——— محمودیہ پبلک اسکول، ۱۰۵/۷۔ A گلی نمبر ۹
چوہان بانگر، نیو سیلم پور، دہلی ۵۳۰۰۱۱

دوسرا ایڈیشن فروری ۲۰۰۲ء February, 2002

MUGHAL SHAHZADIAN

By: Mehmood Ali

D-105, Chohan Bangar, Seelam Pur, Delhih-53

January 2000 (Y2K)

Rs. 340/-

ایم۔آر۔ پبلی کیشنز، دہلی

601، چوڑی والان، جامع مسجد، دہلی۔6

2652/55، پہلی منزل، کوچہ چیلان

دریا گنج، نئی دہلی۔ 110 002

M. R. Publications

- 601, Churi Walan, Jama Masjid, Delhi-110 006.
- 2652/55, 1st Floor, Khajor Lane, Kucha Chelan,
  Darya Ganj, New Delhi-110 002.

فہرست

تیموریہ خاندان کی شہزادیوں کا شجرہ

بابر

گلبدن بیگم — گل رخ بیگم — گل چہرہ بیگم — احساد و لت بیگم — معصوم سلطان — مہر جہان

ہمایوں

بخت النساء بیگم

اکبر

شہزادہ خانم بیگم (والدہ عرش آشیانی)

جہانگیر

بہار بانو بیگم

شاہجہاں

جہاں آرا بیگم — حور النساء بیگم — روشن آرا بیگم — گوہر آرا بیگم — ثریا بیگم — نواب قدسیہ بیگم

معظم سلطان

بچھنی بیگم

دارا شکوہ

جانی بیگم — زیب بانو

محمد اکبر سلطان

رضیہ النساء بیگم

سلیمان شکوہ

سلیمہ بیگم

شجاع

دبند بانو بیگم — گل رخ بیگم — خیر النساء بیگم — دلپذیر بیگم

اورنگ زیب

زیب النساء بیگم — زینت النساء بیگم — زبدۃ النساء بیگم — بدر النساء بیگم — مہر النساء بیگم — بادشاہ بیگم

مراد

آسائش بیگم — ہمراز بیگم — دولتدار بیگم

بہادر شاہ ظفر

• کاشفہ سلطان بیگم • نبھی بیگم • آغا بیگم • مبارک النساء بیگم • براتی بیگم • شبینہ بیگم • مکھولی بیگم • دلبہ الزمانی بیگم

• حسن زمانی بیگم • نواب بیگم • حاجی بیگم • کلثوم زمانی بیگم • جمیا بیگم • اورنگ زمانی بیگم • پیاری بیگم • بسی بیگم

• نبھی بیگم (خورد) • حمید الزمانی بیگم • ثالث زمانی بیگم • قطبی بیگم • بلاقن بیگم • مریم بیگم • رالعہ بیگم • خانم زمانی بیگم

• قرینہ سلطان بیگم • سلطان زمانی بیگم • خیر النساء بیگم • ستارہ سلطان بیگم • افسر زمانی بیگم • تہنیت آرا بیگم • خاتون زمانی بیگم

جن شہزادیوں کے زندگی کے حالات معلوم ہوسکے ان کو کتاب میں تحریر کر دیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

تمہید

ہندوستان کی تاریخ میں مغلیہ دور بہترین زمانہ تھا اسی لیے اس کو عہدِ زریں کے نام سے تحریر کیا جاتا ہے، اس دور میں عالی شان عمارات تعمیر ہوئیں بقول مسز بیسنٹؔ ہندوستان پہلے سے زیادہ مالدار بن گیا یہ دور علم پروری طاقت و جبروت مذہبی روا داری مشترکہ تمدن اور قومی یک جہتی اور خوشحالی میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ اور یہ ہی وہ امور ہیں جن کے باعث مغل اعظم کی سطوت و جبروت کا سکہ شاہان یورپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مختلف علوم و فنون نے اس زمانہ میں بے انتہا ترقی پائی، عوام کی تعلیم کے لیے مدارس کھولے گئے، شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اکبر کے فرامین اور اورنگ زیب کے خطوط سے شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم و تربیت کا علم ہوتا ہے۔ ان کے لیے قابل ترین معلم مقرر کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شہزادیوں کی کنیزیں تک دماغی نشو و نما کی اعلیٰ منازل تک پہنچ گئی تھیں، شہزادوں اور شہزادیوں کو اخلاقی و ذہنی تعلیم کے علاوہ فنونِ جنگ سے بھی مزیّن کیا جاتا تھا۔ گلبدن بیگم، گل رخ بیگم، نور جہاں بیگم، جہاں آرا بیگم، زیب النسا بیگم وغیرہ تعلیم و تربیت، قابلیت، لیاقت، ذہانت، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، شاعری کے لحاظ سے ان بیگمات میں سے ہیں جن پر ہندوستان سدا فخر کرتا رہے گا۔ اور ان کے کارنامے جو انھوں نے محدود حدوں میں رہ کر بنی نوع انسان کی ترقی کے لیے انجام دیے تھے، تاقیامت روشن رہیں گے۔ اُن کی بے لوث زندگی انسانی ہمدردی، زہد و تقویٰ غربا پروری شرافت و لیاقت پاکیزگی وغیرہ۔ ہمیشہ ہمیشہ آئندہ نسلوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مغل شہزادیوں کے علاوہ کتاب کے ضمیمہ میں ان بیگمات اور ہندو رانیوں کا بھی ذکر لازمی سمجھا جن کے بغیر کتاب مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ انھیں خواتین نے ہندوستانی نسوانی زندگی کو قابلِ رشک

بنا دیا ہے اپنی قابلیت کے جواہر دکھا کر اور مردوں کے دوش بدوش کام کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ

"عورت کی زندگی کے حیات افروز واقعات زبان حال سے کہہ رہے ہیں
کہ عورت کے نازک بازو اور کمزور ہاتھ شیر خوار بچّوں کا پنگھوڑہ ہلایا کرتے ہیں
اور کبھی کبھی یہ ہی ہاتھ قوموں اور سلطنتوں اور انسانوں کی قسمت کا فیصلہ
بھی کیا کرتے ہیں"

کتاب میں ان عظیم خواتین کا ذکر ہے جن کے کارناموں سے صفحات تاریخ درخشاں ہیں۔ ان کا دائرہ علم باہر کے واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس اندرونی دائرہ میں بھی قدم رکھتی ہیں جن سے اکثر مورخین ناآشنا ہیں دوسرے مورخین کی طرح وہ باہر کے اسٹیج پر نظر نہیں رکھتیں بلکہ پس پردہ بھی دیکھ سکتی ہیں۔

جن خواتین کا کتاب میں تذکرہ ہے ان کے بلند حوصلہ اور آزاد بیانی قابل ستائش ہے۔ ایسی خواتین خاندان ملک وملت اور قوم کے لیے باعثِ ناز وافتخار ہوتی ہیں، انھیں کی بدولت قومیں بنتی ہیں انھیں کے ذریعہ مذہب وملت کا نام روشن ہوتا ہے انھیں کی بدولت قوموں کے بخت جاگ اُٹھتے ہیں اور ادبار نکبت کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور شجر امید بار آور ہوتا ہے۔

محمود علی

مقدمہ

اسلامی تمدن نے جہاں اور بہت سے احسان کیے ہیں وہاں اس نے ہندوستانی نسوانی زندگی میں بھی انقلابِ عظیم پیدا کر کے اسے قابل رشک بنا دیا ہے۔

قرونِ وسطیٰ کی بہت سی نسوانی تحریکات اسلامی تمدن کی صدائے بازگشت ہیں اسلام نے عورت کے جائز حقوق تسلیم کرتے ہوئے اس حسین لطیف کو ہر شعبۂ زندگی میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دورِ تیموریہ میں بعض قدسی منش خواتین نے اپنی قابلیت کے جواہر دکھائے۔

قرونِ وسطیٰ میں عورتوں کی ذہنی ترقی مختلف طبقات میں مختلف ہوتی تھی۔ اعلیٰ طبقہ کی خواتین ایک مہم جویانہ اور غیر محفوظ زندگی بسر کرتی تھیں اسی وجہ سے وہ بہت سے علوم وفنون سیکھنے پر مجبور تھیں افغان خواتین کی جانبازی اور حوصلہ مندی کی دو مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔

(۱) ایک موقع پر خواتین نے مردانہ لباس پہن کر دہلی کے قلعہ کو دشمنوں سے بچایا اور دشمن کے تیروں کی بارش کو برداشت کرتی رہیں [1]

(۲) کشمیر کے پہاڑی علاقے میں لڑتے ہوئے عورتوں نے تیروں، کمانوں، تلواروں اور نیزوں سے مسلح ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا آخر کار پتھروں کے نیچے دب کر جان دیدی اور اوپر سے دشمن کے تیروں کی بارش ہوتی رہی۔

---

[1] تاریخ داؤدی

[2] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۸۸

دیول رانی درگاوتی، تارا بائی، روپ متی اور میرا بائی ہندو تہذیب کی اچھی مثالیں ہیں۔ حاجی دبیر کا بیان ہے کہ ہمایوں پہاڑی پر محمد بن تغلق کے حملے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ وہ ان علاقوں کی عورتوں کو حاصل کرنا چاہتا تھا جو اپنی شائستگی کے لیے مشہور تھیں۔ رضیہ سلطان کی تخت نشینی اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان شاہی خاندان اور امراء اپنی خواتین کو بہترین تعلیم سے بے بہرہ نہیں رکھتے تھے مغلوں کے دربار میں خواتین کی تعلیم و تربیت نے اور زیادہ فروغ پایا۔

گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ "ہمایوں کے شاہی حرم کی خواتین مرد دوستوں اور مہمانوں کے ساتھ آزادی سے ملتی جلتی تھیں بعض اوقات یہ خواتین مردانہ لباس زیب تن کر کے باہر جاتی تھیں پولو کھیلتی تھیں اور موسیقی سے دل بستگی کرتی تھیں وہ غلیل کے استعمال اور دیگر فنونِ لطیفہ کی بھی ماہر تھیں"۔

احمدزکی آفندی (مصر کا باشندہ) اپنے سفرنامہ السفرالی الموتر میں بیان کرتا ہے کہ "پیرس جو فرانس کا دارالسلطنت ہے اس کی تعریف کرتا ہے کہ پیرس میں جو دائرۂ عرفان کا مرکز ہے عالم کا سیرگاہ عظمت و شان و شوکت کی تصویر نزاکت و لطافت کا پیکر علوم و فنون کی جان ہے اور بہشتوں کی بہشت ہے وہاں کی عورتوں کی حالت پر تعجب کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ نوعِ انسانی کا نصف حصہ عورت جو ہمارے ملک میں بالکل بے کار چیز ہے یہاں وہی تمام ترقیوں کی روح ہے اور اس کی اس قدر عزت کی جاتی ہے کہ فرانس کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ "جو عورت کی مرضی ہے وہی خدا کی مرضی ہے" وہ آگے بیان کرتا ہے کہ تمام علوم و فنون میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کرتی ہیں یہاں تک کہ انشا پردازی، مضمون نگاری، شاعری، مصوری، وکالت، طباعت ایجاد و صنائع ان تمام فنون میں اعلیٰ درجہ کی کامل عورتیں موجود ہیں تاہم اس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یورپ میں جو عورتوں کو آزادی حاصل ہے وہ سخت اعتراض کے قابل ہے"۔

عہدِ نبوی میں جو درجہ عورتوں کو حاصل تھا آج ناپید ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اسلام میں مرد کی طرح عورت کے ایمان اور عمل کو ہی اس کا انفرادی معاملہ قرار دیا گیا ہے اس کے اعمال کا شوہر، بھائی اور باپ سے کوئی لینا دینا نہیں۔ سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے واضع طور پر نبیؐ کو ہدایت کی ہے کہ اپنی ازدواجِ مطہرات سے کہو کہ گھروں میں شائستگی سے رہا کریں اور نامحرموں کے ساتھ نگاہیں نیچی کر کے بات کریں۔ گھر کی بیویوں بیٹیوں اور پاکیزہ عورتوں کے لیے ہدایت ہے کہ وہ گھر سے نکلتے وقت جل باب ڈال لیا کریں۔

قرآن اس بات کا برملا اعلان کرتا ہے کہ اسلامی تحریک عورتوں کی شرکت کے بغیر نامکمل ہے۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے لیے معاون ہیں عہدِ نبویؐ کی بیشتر مثالیں ملتی ہیں جہاں عورتیں درس وارشاد کے منصب پر فائز رہیں، خارجی امور میں، میدان جنگ میں عورتوں نے فوج کی سپلائی لائن کے طور پر کام کیا۔ امت کے ہر سیاسی اور سماجی پروگرام میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ عہدِ نبویؐ میں سنگین دور ایسا بھی آیا جب حضرت عائشہؓ کو جنگِ جمل میں کلی طور پر کمان سبھالنی پڑی اس جنگ میں ایک طرف سیدہ عائشہؓ تھی اور دوسری طرف حضرت علیؓ تھے، ایک بار حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ایک باغ کا تنازع کھڑا ہوا تو حضرت عائشہؓ نے مدلل طور پر اپنے حق کے لیے کوئی کمی نہیں چھوڑی اسلام کی آمد سے غلام اور عورت کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا ہے دونوں کو ہی مکمل انسانیت کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ایک بار جب اسلامی لشکر رسولؐ کے احکام بجا لانے میں پیش پیش کا مظاہرہ کر رہا تھا تو پریشانی کے عالم میں آپ اُمّ سلمہؓ کے خیمہ میں تشریف لائے اور اُمّ سلمہؓ کے مشورہ سے بحرانی کیفیت ختم ہوگئی۔ ثابت یہ ہوا کہ اچھی بات مرد کی ہو یا عورت کی مفید ثابت ہوگی۔

خلفۂ راشدین کے عہد میں بھی عورتوں کے مشورہ کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ خلفہ کے انتخاب میں بھی عورت کی رائے شامل رہتی تھی لیکن آج کے سماج اور سیاست میں فیصلہ کا کلی اختیار مرد کو ہی ہے، عورت کا کردار مرد کے تابع رہا ہے عورت اور پسماندہ طبقہ ہمیشہ حاشیہ پر ہی رکھا گیا۔

یہ بات دیگر ہے کہ مرد نے اپنی عزت اور تاج و تخت بچانے کے لیے عورتوں کو قربان کیا قربانی نہیں کہا جاتا اگرچہ عورت جنگ سے نفرت کرتی ہے مگر مرد کی خاطر وہ اپنے بیٹوں کو قربان کر دیتی ہے قوموں کے عروج میں عورتیں نظر انداز کر دی جاتی ہے مگر جب زوال ہوتا ہے تو عورت ہی کو زوال کا سبب بنا دیا جاتا ہے حالانکہ قتل و غارت گری سے اس طرف لوٹنا عورت کی فتح ہے مرد کی نہیں۔ اگر مرد اور عورت مل جل کر معاشرہ کے استحکام اور ترقی کے لیے مشترکہ طور پر اپنے اپنے میدان میں باہمی ربط و ضبط سے کام کریں تو مہذب اور شائستہ معاشرہ تعمیر ہو سکتا ہے اور زندگی کی عظیم ترین بلندیاں حاصل کر سکتا ہے۔

دراصل دنیا کے جتنے مسلم ممالک ہیں ان کی اپنی روایت اور ثقافت ہے اسلام ایک آفاقی عقیدہ ہے لیکن ثقافت ہمیشہ زمین سے اگتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج مسلم عورت ارضِ فارس سے مشرقِ وسطیٰ تک اور افغانستان سے کشمیر تک ثقافتی غلامی کا شکار ہے۔

عورت بیٹی کی شکل میں نسلوں کا درد بھگتی ہے مذہب کی سازش اور تہذیب کا جھوٹ برداشت کرتی ہے خاندان کی غربت بھائی کی بیکاری اور والدین کی بیماری کو جھیلتی ہے شرابی اور جواری شوہر کے استبداد تلے جیتی ہے۔ مگر اتنے پر بھی کبھی گیس سلنڈر پھٹ جاتا ہے۔ اور کبھی مٹی کا تیل اپنا کام کر جاتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیے ان پر عمل نہیں کیا جاتا وہ آج بھی مرد کے مظالم اور احکامات کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہے۔

اسلام امن و آشتی حق و انصاف کا علمبردار ہے اسلام سے پہلے نیکیوں نے معاشرے سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا۔ عورت پر ظلم و زیادتی کی انتہا ہو چکی تھی۔ اسلام کا ظہور ایسے دور میں ہوا جب پوری انسانیت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی کہیں بت پرستی کہیں شرک اور کہیں دورِ وحشت۔ مصر، بابل، ہند، چین، یونان اپنی تہذیبوں کی شمع گل کر چکے تھے۔ روم فارس اپنی اپنی تہذیب کی عظمت کو تو بلند کر رہے تھے۔ مگر ان تہذیبوں کی چمک دمک (مکر چاندنی) آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی مگر ان کے شیش محلوں میں بدترین مظالم کا دور تھا زندگی کے زخموں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ جاگیردار اور مذہبی طبقہ کی ملی بھگت نے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔

حکمراں خدا بنے ہوئے تھے انسانوں بالخصوص عورتوں سے جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کے مسائل سے بالادست طبقہ کو کوئی دلچسپی نہ تھی اعلیٰ طبقہ کی عیاشی اور نفس پرستی نے اخلاقی روح کو ہلاک کر دیا تھا۔ حکومتیں آتش کدوں اور کلیساؤں میں بدلتی رہتی تھی۔ بار بار بغاوتیں اُٹھتیں کشت وخوں اور خوں ریزی ہوتی رہتی تھی۔ عورت کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں وہ ایسے آہنی قفس میں بند تھی جس میں کسی بھی طرف روزن نہیں تھا وہ صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتی تھیں۔

یونان میں عورت کو نجاست کا مجسمہ اور شیطان کی بیٹی سمجھا جاتا تھا اور دیگر اشیاء کے ساتھ بازاروں میں بیچی اور خریدی جاتی تھی۔ میراث میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا نکاح اور طلاق کا پورا اختیار مرد کے ہاتھ میں تھا۔ عام یونانیوں کا خیال تھا کہ سانپ کے ڈسنے اور آگ کے جلنے کا تو علاج ہے مگر عورت کے زہر کا کوئی علاج نہیں۔ رومیوں کا خیال ہے کہ عورت کی بیڑی کبھی کھولی نہیں جاسکتی اور نہ اسے آزادی دی جاسکتی ہے۔ دورِ جاہلیت میں عرب میں عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ خراب تھی۔ لڑکی کی پیدائش پر گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتا۔ عورتیں وراثین میں تقسیم ہوتی تھیں۔ معاشرے میں عورتوں کی خرید و فروخت عصمت فروشی، حسن و جمال اور محبت و وصال کا تذکرہ معیوب نہیں تھا۔ یہودی بھی عورت کو شیطان کی سواری اور بچھو مانتے تھے۔ ہندو مذہب میں بھی عورت ہر اختیار سے محروم تھی۔ شوہر کے ساتھ عورت کو ستی ہونا پڑتا تھا یہ رواج ہند میں آج بھی کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔

اسلام حقیقت میں ضیاءِ حیات ہے اسلام نے عورت کی عظمت و عزت کو بام عروج پر پہنچایا، جبکہ اسلام سے پہلے وہ ذلت و رسوائی اور حقوق تلفی کی شکار تھی۔ اسلام نے عورت کو وہ سب حقوق دیے جو عقل و انسانیت کی رو سے اسے ملنے چاہیے، اسلام نے عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہونے کی حیثیت اور ہر حالت میں اس کا جائز حق دلایا اور ہر طرح اس کے وقار و عزت اور قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔ اس کی عفت و عصمت کا تحفظ کیا اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے بچایا حضور اکرمؐ نے فرمایا جس نے دو یا تین بچیوں یا دو یا تین بہنوں

کی شادی تک پرورش کی یا انھیں چھوڑ کر مرا تو ہیں اور وہ جنت میں دو انگلیوں کی طرح ساتھ ہوں گے۔ اسلام نے والدین کے ادب و احترام پر زور دیا ہے۔ اور ماں کے احترام کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔ اور الجنۃ تحت اقدام الامھات (یعنی ماں کے قدموں تلے جنت ہے) اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی یعنی تم میں اچھا وہ ہے جس کا سلوک اپنے اہل و عیال سے اچھا ہو،

اسلام نے عورتوں کو علم حاصل کرنے کا حق ہی نہیں بلکہ اس پر فرض قرار دیا: "طلب العلم فریضۃ علیٰ کلّ مُسلم" عورت کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کا اختیار دیا اور اس کو میراث میں حصہ دیا اور طلاق کی آخری حدیں مقرر کر کے عورتوں پر احسانِ عظیم کیا، جاہلیت کے دور میں طلاق کی تعداد سو تک پہنچ جاتی تھی اور مرد اسے رجوع کر لیتا۔ ظالم شوہر سے اسے کبھی چھٹکارا نہیں ملتا۔ اس دور میں عورت کو سکون و اطمینان نصیب نہیں تھا۔

آج پوری دنیا خاص طور سے یورپ میں "آزادیٔ نسواں، مساوات نسواں، کا نعرہ لگایا جا رہا ہے اور اخبارات اور بے شمار کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں اور بہت سی کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور اسلام اور مسلمانوں کو نشانا بناتے ہوئے ثابت کیا کہ مسلمانوں نے عورت کو چار دیواری میں قید کر رکھا ہے اور اسے اس کے حقوق سے محروم کر دیا ہے یہ سراسر غلط پروپیگنڈہ ہے آج مغربی معاشرہ جن مصائب و آلام، اضطراب و بے چینی اور افراتفری کا شکار ہے۔ اس کا حل تو اسلام میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ناکامی ہی ملے گی۔

یورپ کے عالم کی حیثیت کو تو جانتے ہیں مگر وہاں کے سماج میں عمل دکھائی نہیں دیتا۔ معروف مصنف ژول کا قول ہے کہ "عورت کو چاہیے کہ عورت ہی بنی رہے ..... اسی میں اس کی کامیابی ہے،" مگر مرد بننے کی جس میں وہ اپنے ہی کو بھول گئی۔ اگر عورت قدرت کے قانون کے مطابق چلے گی تو وہ قدرت کے قریب ہو گی۔ عورت پن کی خوبی ہی اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ اس کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی، ذلت اور رسوائی سے بچ جائے گی۔ تمام یورپ کے علما تمدن کے اس نقصان پر غور کر رہے ہیں، جو قدرتی قانون پر عمل نہ کر کے ہو رہا ہے۔

قدیم جاہلیت نے عورت کو جس پستی کے گڑھے میں پھینک دیا اور جدید جاہلیت نے اسے آزادی کا لالچ دے کر جس ذلت سے دوچار کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے قدیم جاہلیت نے اسے زندگی کے حق سے محروم کیا تو جدید جاہلیت نے اسے زندگی کے ہر میدان میں دوش بدوش چلنے کی ترغیب دی اسے گھر کی چار دیواری سے نکال کر شمع محفل بنادیا عورت اپنی عزت کھو بیٹھی آزادی کے نام پر غلامی کا شکار ہو گئی آج مغربی عوام میں عورت اس غلامی بنام آزادی سے تنگ آچکی ہے۔ کیونکہ مغربی تمدن میں اسے بے جا آزادی کے نتائج بے حیائی کی شکل میں رونما ہو رہے ہیں۔ افسوس آج مسلمان عورت بھی اسی آزادی کے حصول میں سرگرداں نظر آتی ہے۔

عورت کے اعلیٰ کردار تعلیم وتربیت کا اس کی اولاد پر براہِ راست اثر پڑتا ہے جس سے معاشرہ وجود میں آتا ہے جس طرح پاکیزہ معاشرہ ہوگا اتنی ہی عورت عزت واحترام کے ساتھ قدر و منزلت کی بلندی کو پاکر اپنے ابدی گھر "جنت" کے اعلیٰ مقام کی مالک بنے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> "میں تمہیں نازک آبگینوں کے بارے میں وصیت کرتا ہوں یعنی خواتین تم میں سے بہتر وہ ہے جو ان کے ساتھ عزت وتکریم کے ساتھ رہنے والا ہو اور تم میں سے بدبخت وہ ہے جو ان کے ساتھ اہانت سے پیش آتا ہو۔"

> اسلام میں عورت مرد کے برابر ہے ان میں جسم کی ساخت کے سوا کوئی فرق نہیں وہ دونوں کائنات کو دوام بخشنے کے لیے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں حقوق و فرائض اور آزادی قول و فعل میں دونوں برابر ہیں۔ اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو فوقیت عورت ہی کو حاصل ہے اسکے لطیف احساسات نزاکت طبع اور بھاری ذمہ داریوں کے باعث"

اسلام نے عورت کی قدر و منزلت کے دعوے ہی نہیں کیے بلکہ علم و عمل میں، تدبیر میں، سیاست میں، بہادری اور شجاعت میں، تہذیب و تمدن میں غرض عورتوں کے چند خصائل کے علاوہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں اپنی عملی حیثیت سے مردوں کے دوش بدوش لاکر کھڑا کر دیا ہے اگر اس نے مردوں کی صف سے خلفائے راشدین جیسے مجموعہ حسنات۔ ہدایت کو دنیا کے لیے پیش کیا ہے تو عورتوں کی جماعت سے حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت صفیہؓ حضرت زینبؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ جیسی خواتین کو زہد و تقویٰ نیکی اور پارسائی علم و عمل کے قابل تقلید نمونے بنا کر اقوام عالم کے لیے رو برو عبرت و بصیرت کی غرض سے پیش کر دیا" سورہ بقرہ ۱۸۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ ترجمہ وہ تمہارے لباس ہیں تم ان کے لیے لباس ہو۔ گویا قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ مرد کی زندگی میں بہت سے ایسے تشنہ پہلو ہیں جن کی آسودگی کا سامان عورت ہی فراہم کر سکتی ہے اور عورت کی زندگی کے متعدد گوشے مرد کے بغیر محتاجِ تکمیل رہتے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآن پاک نے کہا ہے کہ یہ رشتہ غصہ اور نفرت کا نہیں الفت و محبت کا رشتہ ہے اس کی ترکیب دشمنی و عداوت کے عناصر سے نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں محبت اور چاہت تحلیل کی گئی ہے یہ تعلق بغض و کینہ کی تخم ریزی کے لیے نہیں بلکہ دل بستگی اور شیفتگی کی نشو و نما کے لیے وجود میں آیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ بھی بتاتا ہے کہ زندگی کی گہما گہمی اور نشیب و فراز میں ہمیشہ مرد اور عورت میں سے ہر ایک دوسرے کا معاون اور مددگار رہا ہے زندگی کے بارِ گراں کو دونوں نے سنبھالا ہے تمدن کا ارتقا دونوں کے اتحاد سے عمل میں آیا ہے دنیا کی کوئی قوم ان میں سے کسی بھی طبقہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی جس طرح حق کے فروغ اور اس کے غلبہ و اقتدار میں مرد عورت دونوں شانہ بشانہ مصروفِ عمل نظر آتے ہیں اسی طرح باطل کی ترقی اور استحکام میں بھی دونوں حصے دار ہیں اور شریکِ کار ہیں۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثقافت کو بڑھاوا دینے میں عورت اور مرد نے

مساوی حصہ لیا ہے عورت کی نفاست پسندی فطری ملامت اور حسنِ مذاق کے بغیر سماجی دنیا نامکمل ہے اور جب کہ مرد کی خود اعتمادی جولانی اور دلیری کے بغیر عورت کی حیثیت بھی ادھوری ہے گویا باغِ ہستی کی رونق کے لیے مرد اور عورت لازم وملزوم ہیں۔

اسلام کی حیثیت سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں مگر شہری حقوق کی نوعیت عورت کے لیے کسی قدر بدل جاتی ہے کیوں کہ اسلامی قانون کے مطابق مرد کو مرد عورت کو عورت سمجھا جاتا ہے کیوں کہ عورت وہ ہر کام نہیں کر سکتی جو مرد کر سکتا ہے دونوں کے کام بھی الگ الگ ہیں عورت اور مرد کے قدرتی رجحانات میں فرق ہے دوسرے عورت تو گھر کے ذمہ داریوں سے لدی ہوئی رہتی ہے یہ سراسر ناانصافی ہے اور ستم ظریفی کہ عورت مرد کے کاموں کو بھی انجام دے دونوں کے حقوق و فرائض بھی جداگانہ ہیں۔ عورت بھی مرد کی طرح اپنا وقار اور قدر رکھتی ہے جس طرح مرد اللہ کی عبادت اور بندگی کر سکتا ہے اسی طرح عورت بھی اللہ کی عبادت اور بندگی کر سکتی ہے دین اور اخلاق کے بارے میں دونوں ایک دوسرے سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کے بارے میں تمام علماء کی رائے ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت عائشہؓ کو پیدا نہ کرتا اور حضور کی زوجیت میں نہ آتیں تو امت کو آدھا دین ملتا لیکن عورت ہونے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کو وہ مقام نہیں دیا گیا کہ وہ میدانِ جنگ میں فوج کی قیادت کریں۔ مجاہد مرد بھی اس وقت تک جہاد نہیں کر سکتا جب تک اس کے گھر کا مجاہد گھر کی مکمل دیکھ بھال کرنے میں اپنی قوت نہ لگا دے۔ یعنی میدان جنگ کا جہاد گھر کے جہاد کا مرہونِ منت ہے اس کا صاف مطلب ہے کہ جس طرح چاند اور سورج کے الگ الگ کام ہیں اسی طرح مرد عورت کے جدا جدا کام ہیں اگر ایک دوسرے کے کام میں رکاوٹ بنے گا تو کام صحیح نہیں ہوگا وہ عورت جو خالدؓ، ضرارؓ، صلاح الدین ایوبی جیسے بہادر پیدا کر سکتی ہے وہ میدانِ جنگ میں فوج کی قیادت نہیں کر سکتی۔

آج اسلام دشمن تحریکوں نے سائنسی اور سیاسی ترقی کی بدولت مسلمانوں پر ہر طرح کی برتری حاصل کر لی ہے عورتوں کے پردے پر اعتراض کرنے والوں کا کہنا ہے کہ پردہ عورت کی صحت کو برباد کرنے کے ساتھ اخلاقی قوتوں میں خلل ڈالتا ہے پردہ نشین خواتین کی کمزوری ہے کہ وہ خواہشوں کو روکنے میں قاصر رہتی ہیں اور وہ نفسانی خواہشات کی قید میں گرفتار ہو جاتی ہیں دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پردہ عورتوں کو حصولِ علم میں بڑی رکاوٹ ہے وہ ذہنی قوتوں کی نشو و نما کے راستے میں حائل ہے تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مرد اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ نہیں سکتا۔ نتیجہ باہمی ناچاقی اور پھر کثرتِ طلاق۔

اس مغربی نظریہ کی ہم اس طرح تردید کرتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں نہ تو کمزور ہیں اور نہ مریض وہ تو بے پردہ عورتوں سے زیادہ صحت مند ہوتی ہیں اگر ایسا ہوتا تو چودہ سو سال پردہ میں رہ کر وہ اپنا وجود ہی کھو دیتیں اور ان کی نسل تو نہایت ہی کمزور ہوتی چلی جاتی مگر ہم بایولوجی کے حکم کے خلاف دیکھتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں صحت مند بھی ہوتی ہیں اور ان کی اولاد بھی تندرست و توانا غیر متعدد بلند حوصلہ، بہادر اور اخلاقی قوتوں سے بھرپور نظر آتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی نہ مریض ہے نہ کمزور اور یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ ان کی عمر بھی دراز ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ روہیلہ، لودی، پٹھان مغل وغیرہ قومیں اپنی عورتوں کا سایہ بھی نامحرم کو دکھانا نہیں چاہتے یہ ہی خوبی راجپوت عورتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بھی پردہ نشین ہوتی ہیں انھیں عورتوں نے بھیم، ارجن اور پرتاپ جیسے غیرت مند اور بہادر جیسے پیدا کیے جب سے ان عورتوں نے پردہ چھوڑا ایک بھی ارجن اور بھیم پیدا نہ کر سکیں۔ لوگوں کا یہ بھی اعتراض ہے کہ پردہ نشین عورتوں کو نہ تو تازہ ہوا ملتی ہے نہ روشنی، صرف اندھیری کوٹھری میں قیدی کی طرح زندگی گزار دیتی ہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے لوگوں نے پردہ نشین عورتوں کا نہ تو رہن سہن دیکھا ہے نہ ان کے مکانات محلات دیکھے ہی نہیں ان کے مکانات تو بہت وسیع ہوتے ہیں بے پردہ عورتوں کے

مکان صرف ان کے صحن کے برابر ہوتے ہیں پردہ کی بدولت ہی تعمیرات میں جو ترقیاں ہوئیں صرف مسلمانوں کا ہی طفیل ہے ان کے محلات ملک و قوم کی آبرو عظمت اور فنِ تعمیر کے بے مثال نمونے ہیں مکانوں میں برآمدے، کھڑکی، روشن دان با دکش جھرکے یہ سب پردے کی ہی دین ہیں۔

مغرب کے مفکرین اور مورخین نے مسلمان عورت کا نہایت بھیانک نقشہ پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں عورت انتہائی پسماندہ اور مرد کے ظلم و ستم اور ہوس کا شکار بنی رہی اسی طرح مسلمان عورت بھی مرد کی قید میں گرفتار رہی اور علم و ادب تہذیب و تمدن میں کوئی خدمت نہ کر سکی جس کا راز صرف پردہ ہے۔ چنانچہ مسلم عورت اس فلسفہ سے متاثر ہوئی کہ یورپ کا فلسفہ صحیح ہے مسلم عورت نے سوچا کہ مرد کے حکم پر قید ہو کر مکان میں بند ہونے سے سیاست کی اسٹیج پر میری آواز بلند نہیں ہو سکتی شعر و ادب میں میرے نغمے نہیں گو نجتے مردوں کے دوش بدوش شوسل کاموں میں میرا نام نہیں لیا جاتا تو تاریخ مجھ سے کونسی خدمت کی توقع رکھتی ہے جب تک میرے سر اور منھ پر پردہ رہے گا تب تک خدمتِ تاریخ اور میرے درمیان ایک پہاڑ حائل رہے گا اس مغربی مفکرین کے جھوٹے پروپیگنڈہ نے مسلم عورت کے دل و دماغ کو متاثر کر دیا۔

—— تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت سماجی مذہبی اور ثقافتی خدمت کو انجام دینے میں مرد سے کبھی پیچھے نہیں رہی اور علم و ادب کے فروغ کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اگر ہم اسلام کے دورِ اول اور دوسری صدی ہجری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں خواتین کی ایک بڑی تعداد ان علوم میں منہمک تھی۔ یہ دیکھ کر ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ جو خاتون اپنی ایسی روشن تاریخ رکھتی ہو وہ خود اپنی ہی تاریخ سے بیگانہ ہے اور غلط پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اپنے تابناک ماضی کو تاریک خیال کر بیٹھی ہے۔ تیسری صدی ہجری سے نویں صدی تک ایک

طویل فہرست اور بڑی تعداد خواتین کی دیکھتے ہیں جو حدیث تفسیر اور فقہ میں مصروف نظر آتی ہیں حضرت عائشہؓ کو حدیث و فقہ میں سرفہرست دیکھتے ہیں ان کے علاوہ بہت سی (اور عائشہؓ نام کی جن کی تعداد ۵۵ تھی) محدثات گزری ہیں۔ اسی طرح زینبؓ نام کی ۶۵ محدّثات کا ذکر ملتا ہے [۱]۔

عابدۃ المدینہ نام کی ایک خاتون نے دس ہزار احادیث کی روایت کی ہے [۲]۔ کثیر تعداد ایسی خواتین کی ہے جو بڑے بڑے آئمہ حدیث کی استاد اور شیخ رہی ہیں۔ ان خواتین کے سامنے جلیل القدر آئمہ حدیث زانوے تلمّذ طے کرتے رہے ہیں۔ آسیہ بنتِ جار اللہ اور خدیجہ بنت احمد نے ہی امام سیوطی کو روایت کی اجازت دی۔ امام ذہبی مصنف تذکرۃ الحفّاظ کا بیان ہے کہ "میں نے حبیبہ بنت عبد الرحمٰن مقدسیہ سے حدیث کا سمع کیا [۳]"

ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر نامہ عجائب الاسفار میں لکھا ہے کہ "جب وہ دمشق گیا تو اس وقت جامع بنی امیہ میں مشہور محدّث زینب بنت احمد المقدسیہ (۶۴۶-۷۴۰) درس حدیث دیا کرتی تھی۔ ابنِ بطوطہ اس کے درس میں شریک ہوا اور اس سے حدیث کا سماع کیا"۔ عبد الرحیم العراقی نے رقیہ بنت عبد الغفار سے حدیث کا سماع کیا" علامہ سخاوی نے اپنی کتاب الضوا لامع میں ایسی خواتین کی ایک طویل فہرست دی ہے جن سے موصوف نے حدیث سُنی اور پڑھی اور روایت کی اجازت لی، عبد الرحیم خانِ خاناں کی دُختر نے قرآن کی تفسیر لکھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ خواتین حدیث فقہ تفسیر کے علاوہ دیگر علوم و فنون مثلاً علمِ طب، نحو، عروض، لغت، تاریخ،

---

[۱] اعلام النساء

[۲] مقری

[۳] بحوالہ اسلامی نظام میں عورت کا مقام مائل خیر آبادی صد ۱۸۹

حساب، خطاطی، شاعری، علم نجوم، فلسفہ، منطق، رمل، سیمیا وغیرہ وغیرہ میں مرد سے پیچھے نہیں رہیں۔ بہت سی خواتین قرآن حافظ دکھائی دیتی ہیں امراضِ نسواں امراض چشم، جراحیات، علمِ تشخیص اور اپریشن میں درک رکھتی تھی جسٹس امیر علی نے اپنی کتاب "اسلام میں عورت کا مقام" میں تحریر کیا ہے کہ:

"طافیہ بنت ابوالفرج تاریخ اسلام پر گہری نگاہ رکھتی تھی اور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم پر عالمانہ لیکچر دیا کرتی تھی"۔

عائشہ بنت عثمان بن محمد، قاہرہ میں رہتی تھی۔ بہت بڑی عالمہ تھی قوت حافظہ بہت تیز تھا، شعر و شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ عائشہ الباغونیہ دمشقی علومِ دینی کے علاوہ شعر وادب سے بے حد ذوق رکھتی تھی تصوّف میں ڈوبی رہتی تھی۔ مقریزی کی زوجہ سوال رمل نکالنے میں ماہر تھی۔ مریم بنت نصراللہ نحاس نے حروفِ تہجی کی ترتیب پر "معرضِ نسا" کتاب لکھی۔ حافظ ابن حجر کے مشائخ میں زینت بنت عثمان دمشقیہ، زینب بنتِ محمد بن عثمان الامشقیہ اور زینب بنت محمد الامشقیہ بھی ہیں۔ عائشہ بنت عبدالہادی جوہریہ بنت احمد الہکاری اور زہرہ بنتِ عمر جحستہ بنت ابوالوفا بھی اسی صف میں آتی ہیں۔ محدثہ حمو بنتِ احمد الحمبیہ اپنے زمانہ کی مشہور عالمہ تھی۔ آسیہ بنت جاراللہ، آسیہ بنت احمد، آمنہ بنت محمد رشیدی، آمنہ بنت موسیٰ، اسما بنتِ عبداللہ، خدیجہ بنتِ فرج وغیرہ اپنے زمانہ کی معروف ائمہ تھیں۔ اُمّت الولا زینب بنت الحسین، زلیخاں بنتِ اسمٰعیل فاطمہ بنت احمد یحییٰ فقہ کی مشہور عالمہ تھیں۔ مکناس کی خاتون رحمت بنتِ الجنان تعبیر قرآن میں امامت کا درجہ رکھتی تھیں۔ امتہ انوار حسین، نحو اور حساب میں اعلیٰ پیمانے کی درس گاہ رکھتی تھیں۔ امتہ الخالق بنت عبدالطیف کو اعلام النسا راعلیٰ درجہ کی مصنفہ مانا ہے۔ اس کے قوتِ حافظہ کی بھی بڑی تعریف کی ہے۔ دھما بنت یحییٰ، الروضیہ اندلس بھی اپنے زمانہ کی معروف عالمہ تھیں۔ بنت الکبیر نامی ایک لڑکی نحو ولغت کی امام تھی فاطمہ الازہریہ مصری عروض

ونحو کی ماہر تھی عائشہ تیمور مصری انھیں کی شاگردہ تھی۔ امام سیوطی نے طبقات النحو مین میں لبنیٰ کاتبہ کی عالمہ ہونے کے بارے میں لکھا کہ وہ اپنے زمانے کی بے مثال تھی اسماء قسطنطنیہ کی معروف خطاطہ تھی۔

حلیمہ بنتِ صادق ترکی کی مشہور خطاطہ تھی۔ بادشاہ نامی خاتون خطِ یاقوتی میں قرآن لکھا کرتی تھی۔ غرناطہ کی سیّدہ بنت عبدالغنی قرآن حافظ تھی اور فنِ کتابت کی ماہر تھی اس نے امام غزالی کی کتاب "احیاء العلوم" اور دیگر معروف کتابوں کی کئی بار کتابت کی جو پیسہ اس کو انعام میں ملتا تھا وہ قیدیوں اور مجبور ولاچاروں پر خرچ کر دیتی تھی۔ صارۃ الحلبیہ شامی بڑی ادیبہ اور طبیبہ تھی، خطاطی میں بھی ماہر تھی۔ سونے کو کیمیائی طریقے سے محلول کر کے قرآن لکھتی تھی۔ فاطمہ بنت حسن اقرع بھی معروف خطاطہ تھی۔ یاسمین جو پہلے گلبرگہ اور پھر دہلی میں آکر بس گئی، مشہور کاتبہ تھی اور مشہور شاعرہ بھی تھی۔ اخت الحفید ابوبکر فنِ طب میں ماہر تھی، امراضِ چشم کی ماہر تھی آپریشن کرنے میں ابوعبداللہ الکنانی درک رکھتی تھی، خطاطی میں ماہر تھی، جنگی ہتھیاروں کے استعمال کرنے کی حیرت انگیز مشق رکھتی تھی، تاج الاول ۔ جو فلسفہ اور منطق میں ماہر تھی عائشہ بنت عبداللہ حدیث اور تاریخ میں گہری نظر رکھتی تھی، اپنے دادا ابن طبری پر اس نے ایک کتاب بھی لکھی۔

اسلام میں اخلاقی تعلیم میں سب سے زیادہ اہم تعلیم خدمتِ خلق (معاشرہ) ہے لاچار مجبور مفلس ونادار مساکین مصیبت زدگان کی امداد رفاہ عام کے لیے ادارے قائم کرنا شفا خانے کھولنا وغیرہ میں بھی مسلم خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ الف بنتِ محدّث علم الدین کے پاس طلبہ گرد ونواح سے درس لینے آتے تھے۔ خاتون، ان کے مصارف خوراک لباس رہائش کا بھی انتظام کرتی تھی۔ بیواؤں کی تلاش میں رہتی تھی ان کے آرام کی کوشش کرتی تھی۔ ابنِ بطوطہ ایک شامی خاتون بنتِ امرلفظی کے بارے میں لکھتا ہے کہ "جب ہم اس خاتون کے پاس گئے وہ صحن میں بیٹھی قرآن کریم

پڑھ رہی تھی ان کے ایک طرف دس بوڑھی عورتیں درس سن رہی تھیں اور دوسری طرف بیس نوخیز لڑکیاں کشیدہ کاری کا کام کر رہی تھیں"۔[1] یہ ہی خاتون خانہ داری کی تعلیم بھی دیتی تھی ادیب الحریری کی بیٹی نے اپنی تمام آمدنی فقراء و مساکین اور قرآن پاک کی تعلیم دینے کے لیے وقف کر دی تھی۔ زینب بن محمد پاشا ترکی نے چارسو غریب خاتون کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی تھی افریقہ کے امیر مغز بن بادیس کی حرم زلیخا نے شہروں اور بستیوں میں ۶۰ ہزار کفن تقسیم کرائے حج کے موقع پر حاجیوں کے لیے برف اور کھانڈ کے ستو تقسیم کرائے بے سہارا حاجیوں کے لیے پانچسو سواریوں کا انتظام کیا خانہ کعبہ پر دس ہزار دینار نچھاور کیے تین سو غلام اور لونڈیاں آزاد کیں فقراء اور مجاہروں کی جھولیاں بھر دیں متوکل علی اللہ کی والدہ شجاع بہت ہی سخی طبیعت خاتون تھی لوگوں کی پوشیدہ طور سے مدد کرتی تھی حج کے راستے میں سخاوت کی بارش کرتی چلی گئیں۔ طغائی ام توک نے جہیز دے کر تمام غلام لونڈیوں کو آزاد کر دیا اور ۸۰ غلام آزاد کیے حاجیوں کے لیے مکّہ میں لگنے والی چنگی معاف کر دی۔ اسماء بنت موسیٰ جوین کی رہنے والی تھی۔ بغیر معاوضہ لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم دیتی تھی۔ فاطمہ الحاضنہ نے ایک بڑا کتب خانہ مسجد عقد کو وقف کر دیا۔

یہ مثالیں تفہیم القرآن، مولانا ابوالکلام آزاد کی "مسلمان عورت" اور مولانا شبلی کی کتاب جسٹس امیر علی کی کتاب "اسلام میں عورت کا مقام" اور مائل خیرآبادی کی کتاب "اسلامی نظام میں عورت کا مقام" تاریخی تحقیق کے بعد تحریر کی ہیں۔ مقدمہ لکھتے وقت سائنٹفک اور فطری اصول اور تاریخی شہادتیں گواہی کے لیے پیش کی گئی ہیں۔

> "محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حقوق کی ایسی حفاظت کی کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ اس کی قانونی ہستی قائم ہوئی۔ جو آج بیسویں صدی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ آزاد عیسائی عورت کو حاصل نہیں"۔[2]

---

[1] عجائب الاسفار
[2] مسٹر پیٹر کر بیٹس

یورپ کے علماء نے بایولوجی، سائیکولوجی تحقیقات اور تجارتی تجربات سے ثابت کیا ہے کہ عورت علمی اور عملی طور پر مرد کے برابر ہے مگر یہ پروپیگنڈہ سراسر غلط ہے علم تشریح الابدان کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ جسم کے اعتبار سے مرد عورت سے قوی ہوتا ہے اس کے علاوہ عورت کے وزن، قد، رگ پٹھے، دل، دماغ، بھیجا سانس کی حرکت، حواسِ خمسہ، پیچ پرزے یعنی ہر لحاظ سے عورت اور مرد کی ہر چیز میں فرق ہے یہ ہی فرق جانوروں کے نر اور مادہ میں ہے ـــــ چڑیوں کیڑے مکوڑے، ہاتھی اونٹ، مرغ، کبوتر، سارس، مور، چیونٹی وغیرہ میں بھی یہ ہی فرق ملے گا۔ نر مادہ کا فرق بقول ایگریکلچر کے ماہرین حیوانات (پیڑ اور پودوں) میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں علمی تجربے سے صحیح ثابت ہو چکی ہیں مرد کے قد سے عورت کا قد بارہ سینٹی میٹر کم ہے مرد کا وزن عورت کے وزن سے پانچ کلو زیادہ ہوتا ہے (انسائیکلوپیڈیا) قوت کے لحاظ سے عورت آدھی ہے عورت کے رگ پٹھے مرد سے کم تیز اور متحرک ہوتے ہیں۔ دل کا حجم، دل کی دھڑکن، دل کا اثر دل کے خون کا اچھال، دل کا رگوں کی طرف خون پھینکنا وغیرہ میں بہت فرق ہے۔ مرد کا دل ۶۰ ڈرام عورت سے زیادہ وزن رکھتا ہے، عورت کا دل کمزور اور ضعیف ہوتا ہے مرد میں اصل اور فطری حرارت عورت سے دوگنی ہوتی ہے۔

فلاسفر پروڈن، نے لکھا ہے کہ "دماغ اور دل کمزور ہونے سے اور وجدان اور عقل کے ضعف کی وجہ سے عورت جس بات اور جس چیز کی اچھائی برائی کے بارے میں قائم کرتی ہے وہ مرد کی رائے کے مطابق نہیں، وہ آگے تحریر کرتا ہے کہ اخلاقی اعتبار سے بھی عورت مرد سے کم تر ہوتی ہے"۔

حواسِ خمسہ یعنی سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے اور دیکھنے کے بارے میں نکولس

اور علامہ شبلی نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ پانچوں طاقتیں مرد کی عورت سے زیادہ قوی ہوتی ہیں۔ مرد کی سونگھنے کی طاقت تو پانچ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ علامہ لومبروزا اور سنیرجی کی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے۔

(۱) اگر مرد عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے تو مرد کی چھونے کی طاقت عورت کی چھونے کی طاقت پر غالب آجائے گی۔

(۲) عورت میں احساس کی کمی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شکم میں بچّہ کا بوجھ لادے پھرتی ہے۔ یہ قدرت کا احسان ہے اگر احساس قوی ہوتا تو کبھی بھی اس کو برداشت نہیں کرتی رسم ستی کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے عورت کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے ورنہ بنی نوع انسان کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کا انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی"

مرد کا بھیجا بھی عورت سے سو ڈرام بڑا ہوتا ہے۔ عورت مرد سے جلد نہ کوئی فیصلہ لے سکتی ہے نہ حوصلہ دکھا سکتی ہے۔ اس کی جلد سوچنے کی رفتار دھیمی ہوتی ہے وہ کسی بات کو سمجھنے میں دیر کرتی ہے پیچ پڑنے بھی عورت کے بھیجے میں مرد سے کم ہوتے ہیں۔

عورت کی کمیوں پر اعتراض کرنے والوں کا کہنا ہے کہ عورت کو ایک مدت سے دبا کر پست اور گرا کر رکھا ہے۔ وہ ہزاروں برس سے مرد کے تسلط، جبر، بے رحمی اور غلامی کا شکار رہی اور آزادانہ پرورش سے محروم رہی ورنہ یہ کمیاں عورت میں نہیں آتیں، اگر اس طرح مرد کو رکھا جاتا تو مرد میں بھی یہ کمیاں ضرور پیدا ہو جاتیں۔ اس کے جواب میں پروفیسر وو فارینی کی دلیلیں ملاحظہ ہوں:

(۱) وحشی قومیں جو ہزاروں سال سے آزادانہ زندگی بسر کر رہی ہیں ان کی عورتوں

اور مردوں میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے ان میں نہ تعلیم نہ تربیت نہ تمدن افریقہ کی وحشی قوموں کی مثال دیکھ لیجیے کیا بونوں نے کبھی اپنی عورتوں کو غلام بنایا تھا یہ تو صرف قدرت کا فیصلہ ہے۔

(۲) اگر عورت کو باہری کاموں سے روکنے پر یہ کمیاں دکھائی دیتی ہیں تو خطِ استوا کے خطے میں رہنے والی عورتوں اور مردوں میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے جب کہ وہاں کی عورتیں مرد کے تسلط سے آزاد ہیں اور باہر کے کاموں میں کھیتی باڑی بھی کرتی ہیں ـــــــ جس طرح امریکہ کے مرد عورتوں میں فرق پایا جاتا ہے وہی فرق افریقہ یعنی دنیا کے ہر خطے میں ملتا ہے۔

جو باتیں پیش کی جا رہی ہیں یہ ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جو صرف یورپ کے علماء کو ہی ملہم سمجھ کر ان کی ہر بات کو وحی کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ باتیں جو بیان کی گئی ہیں، یہ انسائیکلو پیڈیا سے مستند ہیں اور انسائیکلو پیڈیا آج کے علم و فن کا عطر جوہر اور اس صدی کی رایوں کا خلاصہ ہے۔

مائل خیرآبادی اپنی معروف تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ "عورتوں میں تمام کمزوریوں کے ساتھ مرد سے زیادہ جو قوت ہے وہ انفعال اور ہیجان کی قوت ہے اور یہی ایک ایسی چیز ہے جس میں عورت کا پلہ مرد سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قوت سے بھی عورت کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی کیوں کہ انفعال کی زیادتی (یعنی دوسروں سے متاثر ہو جانا) اور ہیجان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت عقل جلدی کھو بیٹھتی ہے اور ناکام ہو جاتی ہے۔ پروفیسر ورفارینی لکھتا ہے کہ مرد میں سوچنے اور ادراک کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور عورت میں انفعال اور ہیجان کا جذبہ بڑھا ہوا ہوتا ہے"[۱]

---

[۱] اسلامی نظام میں عورت کا مقام ص ۲۷

فطری کمزوریوں کی وجہ سے عورت فوجی کام نہیں کر سکتی، نہ قدرت نے اسے اس کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہاں وہ فوجی سپہ سالار تو پیدا کر سکتی ہے اگر یہ کام بھی عورت پر ڈال دیں تو قومی غیرت کا زوال ہو جائے گا۔ نوجوانوں میں حفاظت کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔ قوم میں لڑنے مرنے کی امنگ مر جائے گی وطن کی عزت و آبرو اور مرد کی زندگی کی قدر و قیمت ہی مٹ جائے گی۔ کمانڈران چیف کری اپا نے امرتسر کی تقریر میں عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "دیویو تم گھر کے کام کاج سنبھالو، فوج کے کاموں میں تمھاری ضرورت نہیں، ہمارے پاس مردوں کی کمی نہیں"۔ پھر ۱۹۵۰ء میں گورنر جنرل نے آرمڈ فورسز آرڈیننس کے نام سے ایک ہنگامی قانون لاگو کیا کہ :

"اس قانون کے ذریعے فوج میں عورتوں کی ملازمت اور فوجیوں کی ٹریڈ یونینوں میں عورت کی شرکت پر پابندیاں عاید کی گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ کسی عورت کو فوج میں نہیں لیا جائے گا۔ ہاں ا اگر مرکزی حکومت سرکاری گزٹ کے ذریعے کسی برانچ یا کور کے لیے بطور خاص اجازت دیدے"۔[1]

عورتوں کے برابری کے دعوی دار بھی مان گئے کہ چھوٹے چھوٹے کام جیسے ٹائپسٹ نرسنگ، ٹیلیفون ایکسچینج وغیرہ کو مرد ہی بحسن اسلوب کر سکتا ہے۔ ان کاموں میں بھی عورتیں ۵۰ فی صد ناکام ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ہفتہ دس دن اور دو تین سال بعد دو تین ماہ ایسے ہوتے ہیں جب وہ دوسروں کی محتاج ہوتی ہے۔ عورت مرد سے کمزور جہاں ہے۔ اگر وہ مرد کے کام کرے گی تو ضرور انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اگر عورت اصل کام چھوڑ کر کمانے کے شوق میں باہر نکلتی ہے یا سیاست میں حصہ لیتی ہے تو اسے روحانی اور مادی دونوں نقصان بھگتنے پڑیں گے۔ مرد کے شانہ بشانہ

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء بحوالہ مائل خیر آبادی۔ اسلامی نظام میں عورت کا مقام صہ ۹۷ — ۹۸ ۔

کام کرنے کی ضد میں اگر وہ حیض بند کراتی ہے تو وہ مختلف امراض میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہ کوڑھ کے مرض میں بھی مبتلا ہو سکتی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کی عورتیں اولاد سے بھی محروم رہتی ہیں۔ اگر عورت اپنے ڈھیلے لباس کو چھوڑ کر چست لباس پہنتی ہے جو ڈاکٹری لحاظ سے مضر ہے کیوں کہ اس سے دورانِ خون رکتا ہے اور اس کے جسم کے درمیانی غدودوں کو بند کرنے والا ہوتا ہے۔ گھر بچوں کو چھوڑ کر باہر جانے والی عورت بچوں کے لیے ایک خوفناک وحشی کی حیثیت رکھتی ہے وہ ڈبل کمائی کو کم عقل گھر کی خوشحالی سمجھ کر گمراہ ہو گئی ہے حقیقت میں اس نے خود گھر کی برکت اور رونق ختم کر دی ہے۔ اولاد ماں کی حقیقی محبّت، پیار کو ترس رہی ہے۔ گھر میں چاروں طرف بدحالی اور بدنظمی نظر آتی ہے۔ زیادہ تر پیسہ نوکروں اور ڈاکٹروں کو چلا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے حقوق کے لیے اسٹرائک کرتی ہے تخریب کاری تحریکوں میں حصّہ لیتی ہے توڑ پھوڑ کرنے والے ہنگاموں میں شریک ہوتی ہے تو خود سوچیئے جس کے پیٹ میں ایک جان پل رہی ہے اس پر کیا اثر ہوگا۔ نتیجہ بچّہ کے دل و دماغ میں تخریب، توڑ پھوڑ قتل و غارت گری۔

" قدرت نے عورت کو محبوبیت بخشی ہے اسے ممتا کا جمال دیا ہے مگر محبوبیت کے بدلے وہ دشمن بن گئی ہے۔ قدرت نے عورت کو دلبستگی کا تبسّم عنایت فرمایا مگر اس کے بدلے اس کے چہرے پر لیڈرانہ تیور نظر آنے لگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ دنیا میں مرد کو جو دیا ہے (متاع) سب سے بہتر چیز عورت ہے لیکن آج عورت کمانے کی دُھن میں اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کر رہی ہے جو خوبیاں ایک دشمن کی ہیں گویا وہ بدترین متاع بن رہی ہے "۔

عورت کو باہر دیکھ کر ذوق نظر کے طور پر مرد اسے برداشت کرتا ہے مگر وہ نہ تو عورت کی قابلیت نہ اس کے کسی بھی کام سے متاثر ہوتا ہے سیاسی میدان میں بھی وہ اس کے

حسن سے اپنی آنکھیں سینکتا ہے۔ عورت سیاست میں بھی مرد سے آگے نہ بڑھ سکی مغرب میں بھی عورت کے سامنے یہ ہی نتیجہ آیا۔

خاندان وہ سرچشمہ ہے جہاں اجتماعی اور سیاسی کارکن ڈھالے جاتے ہیں خاندان کے نام کا نام ہی سماج۔ یعنی معاشرہ ہے پھر سماج سے ریاست وجود میں آتی ہے ریاست کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے سب سے پہلے ہمیں گھر کی حالت سدھارنا لازمی ہے مغرب میں عورت سے گھر کا کام نہیں لیا جا رہا جس کا اثر ہمارے مشرق کے گھروں پر بھی پڑا اب مردوں کے لیے گھر کلب اور ہوٹل بن گئے ہیں۔ عورت اگر گھر میں ہے تو گھر چمن ہے باہر ہے تو گھر ڈھول بچے باہر سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں بچوں میں مختلف بیماریاں اور عیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ نوکر اور نوکرانیاں گھر کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ عورت کی پاکیزگی اور پتی ورتا سے خاندانی شرافت غائب ہوتی دکھائی دیتی ہے عورت کی ممتا کا جو جمال ہمارے گھروں کو گھنی چھاؤں دیتا ہے وہ مغربی دنیا کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔

عورت ہی بچوں کو خیر و وقار کا درس دیتی ہے ایسا بچہ ہی مادر وطن پر جان دیتا ہے۔ وطن کا سپوت بنتا ہے۔ ماں کی عزت پر جان دیتا ہے اس کی آبرو برقرار رکھتا ہے مغرب کی دنیا بھی کوئی دنیا ہے جہاں بچہ اپنے باپ کو بھی نہیں پہچانتا۔ ایسی اولاد سماج اور ریاست کو کیا سنبھال سکتی ہے گھر کے انتشار ہی سے سماج اور ریاست میں نت نئی خرابیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔

امریکہ میں عورت وزیر اعظم بنی تو اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ تجربہ یہودیوں نے بھی فلسطین میں کر کے دیکھ لیا ہے۔ وہاں بھی عورت کی درگت ہوئی۔ لنکا، پاکستان اور ہندوستان

کی مثالیں بھی ہمارے سامنے آئیں "جس قوم کی سربراہ عورت ہوگی وہ قوم برباد ہو جائے گی" مرار جی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ "جو عورتیں مردوں کے معاملات میں دخل انداز ہونے کی غیر ضروری کوششیں کرتی ہیں وہ قدرت کی دی ہوئی اس نعمت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ جس سے قدرت نے انھیں مردوں سے زیادہ حسین اور دل آویز بنایا ہے"

پوپ پال بھی عورتوں کی قیادت کو چرچ میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ عورتوں کی قیادت کو خدا کے اصولوں کے خلاف بتاتا ہے"

اگر آج ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل مرد، عورت کا غلام ہی نہیں بلکہ غلام سے بھی بڑھ کر غلام ہے اگر ہم مرد کی روحانی اور جسمانی محنتوں اور تکلیفوں کو جو مرد۔ عورت کے لیے اُٹھاتا ہے اور اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے صرف عورت کے لیے عورت کے طرفداروں کی دلیلیں قدرت کے اصولوں کے خلاف ہیں اور ان کے عقلی گدّے ہیں اور عقلی گدّے کبھی اصول اور قانون نہیں بن سکتے۔ یہ تو بیان کیا جا چکا ہے کہ عورت اور مرد کا آپسی تعاون ایک دوسرے کو کامل بناتا ہے۔ جس سے سماج کی عمارت قائم ہوتی ہے مگر کاموں میں حدود کو توڑنا سماج کی بنیادوں کو کمزور کرنا ہے اسی وجہ سے عورت سے دونوں ہی ہتھیار پردہ اور اخلاق چھین لیے ہیں اسی لیے عورت عورت نہیں رہی اب دنیا کے لوگ عورت کے لطف سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جس کے پلکوں کے پردے میں حیا کے موتی جھلکتے تھے۔ اب وہ زمانہ قریب ہے کہ متمدن ملک شریف عورت سے محروم ہو جائیں گے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے سکون کے لیے پیدا کیا ہے۔ مرد اور عورت سماج کے لیے قابلِ احترام ہیں انسان انسان برابر ہیں کام الگ الگ ہیں جیسے ایک ملازمت کرتا ہے تو دوسرا تجارت اور

تیسرا دونوں کے لیے کھانا بناتا ہے۔

عورتوں کے حاکم بنانے سے ملک میں سازشوں کے جال بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ مردوں کا قلبی سکون ختم ہو جاتا ہے۔ فرانس کا انقلاب روم اور اندرا کا زوال سچے ثبوت ہیں۔ پردہ سے عورت کا باہر آنا معلوم ہوتا ہے کہ پہلو سے دل نکل گیا جب رومیوں کے اعصاب پر عورت سوار ہوئی۔ تب ہی سے حکومت کے شاندار محل اور مضبوط عمارت کی ایک ایک اینٹ بکھر گئی۔

جب وہ پردے میں تھی تو روم ترقی کرتا چلا گیا۔ دنیا کی تاریخ بھی خوب ہے پلٹ پلٹ کر حالات دہراتی رہتی ہے فلاسفر کائن نے پردہ کی بہت حمایت کی علامہ لوئس نے پردہ کی بہت مخالفت کی مگر کائن کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی وہاں مرد اور عورتوں میں رقابت شروع ہوتی رہی اُدھر شیطان اپنا کام کرتا رہا سلطنت کو مردوں نے عورت کے ذریعہ برباد کرایا۔ آج دنیا کا جو نقشہ بنتا جا رہا ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے مرد بری طرح سے عورت سے بدلہ لے رہا ہے اس کو جادوگر شیطان کا ایجنیٹ کانٹوں کی جھاڑی سانپ کی اولاد بتاتے ہوئے ہر طرح سے عیش و نشاط کا سامان مانتا ہے۔

اسلام نے عورت کو اپنے حکیمانہ قوانین کے مضبوط قلعہ میں پناہ دی ہے اسی کی برکت ہے کہ مسلمان خاتون چودہ سو سال ان سارے انقلابوں سے بچی رہی جو اسلام سے باہر کی دنیا میں ہوتے رہے اور عورت اس کا نشانہ بنتی رہی پردہ ایک ایسی نعمت ہے کہ عورت کو مرد کے ہاتھوں کا کھلونہ بننے سے روکتا ہے انسائیکلوپیڈیا کا مصنف عورتوں کے فتنے میں پڑنے کی وجہ سے بڑے دردناک الفاظ میں تحریر کرتا ہے۔

"ہماری موجودہ سوسائٹی میں جس میں عورتوں کو حد سے زیادہ آزادی ملی ہے صاف نظر آرہا ہے کہ عورت کے مذاق کی کمینگی اور اس کی وہ شدید خواہش جو اسے ہمیشہ بناؤ سنگار

اور حسن کو ترقی دینے کی فکر میں مصروف رکھتی ہے آخر کار اس حالت سے بھی کئی درجہ بڑھ کر آفت ڈھانے والی اور بھیانک ثابت ہوگی جو ہم سے پہلے روما والوں پر گذر چکی ہے۔ایک ایشیائی آدمی اس جملہ کو سُن کر۔ چونک پڑے گا کیوں کہ یہ اس کے وہم وگمان میں ہے ہی نہیں اسے ایک مدت سے یورپ کی تہذیب سے حسنِ ظن پیدا ہوگیا ہے وہ مغرب کا غلام ہے"۔ [1]

دُخترانِ ہند میں مولانا محمد علم الدین تحریر کرتے ہیں کہ "تہذیب جدید نے آج ہندوستانی عورتوں کی ذہنیت کو بالکل بدل دیا ہے پہلے تو بانکے سورما پیدا کرتی اور ان کی تربیت کو اہم فریضہ سمجھتی تھیں۔ان کے آغوشِ تربیت نے بنی نوع انسان کے حقیقی خیر خواہ اچھے شہری مذہب کے پرستار بنائے۔ گھر کی ملکہ، چراغ خانہ نہیں مگر آج شمع محفل،——کی پری بننے میں فخر کر رہی ہے۔ وہ سب بھول گئی جو اس کو مذہب و ملت اور تمدن نے اس کے ذمہ عائد کیے فرشتہ خصائل بیٹیوں نے روحانی، تمدن اور معاشرتی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیے۔۔۔۔ کتاب میں اس یورپ کے نظریہ کی بھرپور تردید کی گئی ہے جو یورپ کی عامیانہ تقلید نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اور ہم نے رسم پردہ کو خیرآباد کر دیا ہے"۔

یہ کتاب ان مغل شہزادیوں کی سرگذشت ہے جو باوجود پردہ علم وفن اخلاق تہذیب وتمدن مذہب اور سیاست میں اعلیٰ مقام رکھتی تھیں جو آج کی بے پردہ عورت میں نہیں ملتا۔یہ کتاب ان شریف شہزادیوں کی تاریخ ہے جن کے پردہ میں تمدن اور معاشرتی زندگی کے بہت سے پہلو پنہاں ہیں انھوں نے مسلم تہذیب اور شریفانہ کلچر اور تمدن کی نگہبانی کی ان کی لطیف زبان اور کاموں سے مغل تہذیب پر روشنی پڑتی ہے کتاب کا اصلی مقصد——ہے کہ آج کی خواتین ان کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی سے سبق حاصل کریں۔

قدیم اور وسطی دور کے ہندوستانی سماج میں عورتوں کی حالت کمتر تھی مردوں کی خدمت کرنا ہی عورت کا مقصدِ حیات تھا۔ بیٹی کی حیثیت سے باپ کی سرپرستی میں رہتی تھی۔ بیوی کی حیثیت سے شوہر کی نگرانی اور شوہر کی موت کے بعد اگر وہ زندہ رہتی تو بڑا بیٹا اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس طرح عورت کی پوری زندگی کسی نہ کسی کی نگرانی میں گزرتی تھی اور سماج کے ضوابط اور طور طریق نے اس پر کم مائیگی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ بقول ڈاکٹر کنور محمد اشرف کہ "پیدائش کے وقت اسے ناخواندہ مہمان تصور کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ بدنصیب بیٹی باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتی اسی وجہ سے اسے بچپن میں ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ اگر وہ زندہ رہ گئی تو اسے شوہر کے سپرد کر دیا جاتا اگر اس کی موت دورانِ حمل میں ہو جاتی تو وہ بہت خوفناک بدروح کی شکل اختیار کر لیتی جسے چڑیل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا اختتام موت یا ستی کی حالت میں ممکن تھا یعنی پیدائش سے موت تک عورت کی زندگی ناخوشگوار اور تاریک تھی نہ اس کا مقام قوت و اقتدار میں تھا نہ مذہبی میدان میں پدماوت اور مطلع الانوار وغیرہ سے اس زمانہ کی عورت کی تاریک زندگی کے بہت سے واقعات کا علم ہوتا ہے۔

ٹوڈ کا بیان ہے کہ "راجپوتنی عورت کی زندگی دوسرے ممالک کی خواتین کی نظروں میں خوف زدہ کر دینے کی حد تک سخت تھی زندگی کی ہر منزل پر موت اس کی منتظر رہتی تھی زندگی کے ابتدائی دور میں افیون سے جوانی میں آگ کے شعلوں سے اور درمیانی عمر میں جنگ کی غیر یقینی حالت میں گزرتی تھی۔ اس کی زندگی ایک سال کے لیے بھی قابل وثوق نہیں تھی۔"[1]

ٹوڈ اپنی تصنیف جلد اول کے صفحہ نمبر ۵۴۰ پر کرشنا کنواری کا حادثہ شہزادی صنفِ نازک کی حیثیت کو بیان کرتا ہے کہ :

---

[1] ٹوڈ جلد دوم ص ۳۴۴

"ہم پیدائش کے بعد ہی سے قربانی کا نشانہ بنتی ہیں۔ ہم دنیا میں قدم رکھنے بھی نہیں پاتیں کہ ہمیں پھر وہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے مجھے اپنے والد کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے مجھے اتنے عرصہ تک زندہ رہنے کا موقع دیا۔"

ابن بطوطہ ترکوں کی عورتوں کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ:

"شیراز کی خواتین ہفتہ میں تین بار واعظ کی تقریر سننے کے لیے مسجد میں جمع ہوتی تھیں۔"

بطوطہ کا بیان ہے کہ اس نے اس سے بڑا اجتماع اس سے پیشتر نہیں دیکھا۔ وہ آگے تحریر کرتا ہے کہ

"ہرات کی خواتین پردے کی پابند تھیں لیکن انھیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔" (الرحلہ ج اول صہ ۲۰۰-۲۰۱ ج دوم صہ ۲۲۸)

ڈاکٹر کنور محمد اشرف شہوت پرستی کی ایک خاص مثال تحریر کرتے ہیں کہ:

"ایک بار شیر شاہ سوری کے سپاہیوں نے ایک انتہائی حسین لڑکی کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا اسے دیکھ کر شیر شاہ غصے میں چلایا۔ اس مجسم معصیت کو یہاں سے لے جاؤ۔ اسے دشمن کے کیمپ میں جانے کا حکم دیا۔ شیر شاہ نے سپاہیوں کو سمجھایا کہ اگر اس حسین دوشیزہ کو اپنے پاس رکھ لیتا تو عیاشی کے علاوہ کچھ بھی کر سکتا اور اس طرح سیاسی اقتدار ختم ہو جاتا۔"

خواجہ امیر خسرو ایک ایماندار پاکدامن لڑکی کو مشورہ دیتے ہیں کہ:

"وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کی پیار بھری باتوں میں آنے کے بجائے اپنی جان دیدے۔ (مطلع الانوار، صہ ۱۹۸)

باربوسہ نے اپنی تصنیف "دکن کی خواتین" اور جاتسی کی تصنیف سے بھی عورتوں کی

جانبازی کا علم ہوتا ہے "تاریخ داؤدی" اور "منتخب التواریخ" سے بھی ہمیں اس دور کی کے بارے میں مکمل جان کاری ہوتی ہے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے جو غیر معمولی قابلیت بھی رکھتی تھیں۔ ہندو مذہب کے عقائد کے مطابق عورت کا بیٹے کو جنم دینا ماں کے لیے باعثِ وقار اور عزت تھا، عورت کی زندگی مختلف دور کی تحریکوں سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ عورت کی زندگی میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔

عورتوں کے بارے میں مسلمانوں کی روایات ہر ملک میں جداگانہ تھیں ترک اپنی عورتوں کو اچھی خاصی آزادی دیتے تھے۔ ایرانی عورت ہندوستانی عورت سے نسبتاً بہتر تھی۔ مغلیہ دور میں عورتوں کو زیادہ آزادی نے ان میں عزت اور خودداری کا ایک احساس پیدا کر دیا۔ مشہور مغل شہنشاہوں کی مائیں اپنے میدانوں میں اتنی ہی فنکارانہ صلاحیتوں کی حامل تھیں جتنے ان کے بیٹے اپنے میدانوں میں تھے۔ حمیدہ بانو بیگم، نورجہاں اور ممتاز محل کی مثالیں تعارف کی محتاج نہیں ــــ کم درجہ کی خواتین کے بارے میں مورخین خاموش ہیں اتنا ضرور ہے کہ ان کی زندگی بھی اعلیٰ طبقہ کے مشابہ تھی بعض داشتائیں بھی بہت سلیقہ شعار اور ہنرمند تھیں۔

یہاں رسم پردہ کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ پردہ جس کے معنی حجاب یا کسی چیز کو چھپانا ہے عام طور پر یہ لفظ نقاب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عورت کے لیے یہ اصطلاح اس کے کسی جداگانہ عمارت یا عمارت کے کسی جداگانہ حصہ میں رہنے پر دلالت کرتی ہے۔ عورت کے رہنے کے مقام کو حرم کہا جاتا ہے۔ حرم سے مراد قیام کی جگہ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جملہ خواتین، عوام کی نظروں سے دور رکھی جائے ایک لڑکی جیسے ہی بالغ ہونے کی عمر پر پہونچتی ہے یا اس سے پہلے ہی سے الگ تھلگ رہنا شروع کر دیتی ہے اور اس کی پابندی ہے باہر نکلنے کے بجائے حرم کی چار دیواری میں ہی رہنا زیادہ آرام دہ ہوتا ہے حرم میں اس کی خدمت کو غلام خواتین خواجہ سرائے اور دیگر جملہ ملازمین مامور تھے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پردہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا، مگر کچھ کا خیال ہے کہ پردہ تو ہندوستان میں قدیم — زمانے سے ہی گھونگھٹ کی شکل میں جاری تھا۔ اور عورت سماج میں الگ رہتی تھی اتنا ضرور ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پردہ میں گہرائی اور روایتی پن آگیا جس کے کئی اسباب تھے۔

۱۔ مسلمان اپنے ساتھ طبقہ داری اور نسلی تقسیم و امیرانہ و شاہانہ طرز کے خیالات لے کر ہندوستان آئے غالباً یہ خیالات و نظریات تو کم و بیش یہاں بھی دکھائی دیتے تھے۔ اسی لیے ہندوستان کے سماج میں جلد ہی مقبول ہو گئے۔

۲۔ عورتوں کا مردوں سے الگ تھلگ رہنا تو یہاں بھی موجود تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے یہ بات اور بھی مضبوط ہو گئی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ حملہ آوروں خصوصاً منگولوں کے خوف کی وجہ سے عوام پر یہ احساس بھی طاری تھا کہ وہ غیر محفوظ ہیں۔ یہ خوف تقریباً ۲۰۰ سال سے زیادہ طاری رہا۔

مسلم دور میں عام عورتیں صرف نامحرم سے اپنے چہرہ کو ساڑی کے پلّو سے ڈھک لیتی تھی زیادہ تر ایک ہی شادی کا رواج تھا مرد کا کوئی رقیب بھی نہیں ہوتا تھا اس دور میں عورت بھی مضبوط اخلاق کی حامل تھی اعلیٰ طبقہ کی عورتیں اس حد تک پردہ کرتی تھیں جس حد تک ان کے ذرائع اجازت دیتے تھے کیوں کہ وہ گھریلو کاموں سے آزاد تھیں اعلیٰ طبقہ میں پردہ شرافت کی دلیل تصور کیا جاتا ہے۔ جس کا جتنا بڑا درجہ ہوتا ہے۔ اس کے گھر کی کھڑکیاں اتنی ہی چھوٹی اور بلندی پر ہوتی ہیں اور ان کی خواتین اتنی ہی الگ تھلک رہتی ہیں۔

فیروز شاہ تغلق پہلا سلطان تھا جس نے خواتین کو دہلی سے باہر مقبروں پر جانے سے منع کیا اندرون شہر کے لیے خاص تفصیلات نہیں ملتیں ملّا عبدالقادر بدایونی اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر نے بے پردہ عورتوں کے خلاف سخت قانون بنا دیا تھا۔

"ایک شریف عورت چند مرد ملازمین کے ساتھ بند پالکی (ڈولی) میں سفر کرتی تھی ایک غریب یا امیر کی عورت برقع کا استعمال کرتی تھی۔ سلاطین و امرا اپنی خواتین کے لیے پوری ڈھکی ہوئی مقفل پالکیاں استعمال کرتے تھے ہندو امراء نے بھی اس رواج کو اپنا لیا تا تارخاں کی کنیزیں بند اور مقفل پالکیوں میں سفر کرتی تھیں[1]"۔

تیمور بھی اپنے حرم کو بند پالکیوں میں لے جاتا تھا[2]۔ محمد بن تغلق جب حرم میں داخل ہوتا تو اس کی بڑی احتیاط کرتا تھا کہ اس کی نظر کسی نامحرم پر نہ پڑے[3]"۔

صوفی ہمدانی ان مقامات سے بڑے ڈرتے تھے۔ جہاں مردوں کو عورتوں سے ملنے کے امکانات ہوں۔ خواجہ امیر خسرو مشورہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی عورت لوگوں کی تنقید سے بچنا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ وہ نامحرم کی صحبت سے اجتناب کرے اور اگر وہ کسی بھی طرح کے شبہ یا تنقید سے بالکل محفوظ رہنا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ وہ پردہ کرے[4]"۔ دوسری جگہ بیان کرتے ہیں کہ عورت کی پاک دامنی اس وقت قائم رہ سکتی ہے جبکہ وہ بیرونی دنیا سے قطعًا تعلق نہ رکھے[5]۔

بچپن کی شادی کا رواج ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے مسلم ممالک میں ہر خاص و عام میں پایا جاتا تھا۔ سلاطینِ دہلی اور تیموری خاندان میں یہ رواج عام تھا۔ شادی کے لیے عمر کی کوئی قید نہ تھی ہاں اکبر نے ضرور شادی کے لیے لڑکے کی عمر ۱۶ سال اور لڑکی عمر ۱۴ سال مقرر کر دی تھی مگر اس قانون پر زیادہ عمل نہ ہو سکا۔

کتاب میں مغل شہزادیوں، بیگمات اور اس زمانے کی دیگر اہم خواتین یعنی ہندو رانیوں کی زندگی کے ان پہلوؤں کو تاریخ کے آئینہ میں پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] تصنیف صہ ۲۹۳-۲۹۴ [2] ملفوظات تیموریہ صہ ۲۸۹

[3] برنی صہ ۵۰۶ [4] مطلع الانوار صہ ۱۹۵

[5] اعجاز خسروی، جلد دوم صہ ۲۱۷

جن سے ہماری تمدّنی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے اور اس کو شعور بخشنے میں مکمّل مدد ملی اور وقت پڑنے پر اپنی بہادری کے میدانِ جنگ میں بھی ——— جوہر دکھائے سیاسی توازن برقرار رکھنے میں بھی اپنی قابلیت کا کامیابی کے ساتھ پورا مظاہرہ کیا۔ علم و ادب میں بھی کسی شہزادے سے پیچھے نہ رہیں انھیں پردہ نشین خواتین نے تہذیب و تمدن میں وہ جواہر پارے تیار کیے جو آج کی عورت کو رہنمائی کے لیے مکمّل مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ مُلکی نظام میں قابلِ تعریف کام کیے اور سیاست میں توازن برقرار رکھے۔ اپنی قابلیت کا اظہار کیا اور دستِ سخاوت میں بھی ان کے ہاتھ کبھی کوتاہ نہیں رہے۔ مذہب کی پاسبانی کی کتاب میں تیموری شہزادیوں کی زندگی اور کردار کو مستند تاریخی کتابوں کی مدد سے سچّی تصویر کو تحقیق کے نئے طریقے سے پیش کی گئی ہے۔ کتاب میں مغل حرم کے ان رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہے۔ جن کی مدد سے مغل شاہی خاندان کی زندگی چلتی تھی اور حرم کے ماحول کی وہ تصویر بھی پیش کی ہے جس میں شاہی خاندان کے ذہنی سانچے ڈھلتے تھے شہزادیوں کے عقائد اور زندگی کی دلچسپیوں جن سے ان کے سماجی اور ثقافتی رشتے پیدا ہوتے تھے۔ ان کو واضح اسلوب بیاں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور پر از معلومات بنانے اور اس کام کو پورا کرنے کی اپنے طور پر میں نے ناچیز سعی کی ہے۔

میں نیشنل میوزیم دہلی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جس نے مجھے مغل شہزادیوں بیگمات وغیرہ کے فوٹو لینے کی اجازت فرمائی۔

روزِ ازل ہی سے عورت کی زندگی کے حالات میں عظیم انقلابات ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ویدوں کے اوّل دور میں عورت کو سماج میں اعلیٰ مقام حاصل تھا وہ شوہر کے ساتھ "یگ" میں شریک ہوتی تھی ویدوں کو پڑھتی تھی۔ "اپالا" اور "انوپ مدرا" وغیرہ عورتیں رشیوں کی طرح وید منتروں کی رچنا کرتی تھیں، لیکن ویدوں کے وسطی دور میں عورتوں کو سماج میں کم تر سمجھا جانے لگا کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جہاں "عورت کی

پوجا ہوتی ہے وہاں دیوتاؤں کا نواس ہوتا ہے"۔ ویدوں کے زمانے میں شوہر کی جائداد میں عورت کا حصہ ہوتا تھا۔ عہدِ تیموریہ میں عورت کو مکمل آزادی تھی پھر ایک سے زائد شادیوں اور ستی کا رواج شروع ہوگیا۔ گپت عہد میں بچپن اور بیوہ کی شادی شروع ہونے لگی شوہر کی جائداد میں حصہ سے بھی عورت کو محروم کر دیا گیا عورت کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی ابھی پردہ کا رواج بھی نہیں ہوا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہندو سماج میں بھی بہت سی تبدیلیاں آنے لگیں۔ یہاں ہندوستانی عورت کی حالت کو تحریر کیا گیا ہے تاکہ عورت کی زندگی میں ماضی کے انقلابات کی روشنی میں اس کی حالت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ کتاب میں کچھ گم نام شہزادیوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ان کی زندگی اور ان کے شاہی خاندان سے رشتہ کا صحیح علم ہو جائے ہمارے مصنفین نے تحقیق کر کے ان کے بارے میں صحیح تاریخ نہیں لکھی ہے جس کی وجہ سے بہت سی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں۔ خاص طور سے غیر ملکی سیاحوں اور یورپ کے متعصب اور ناسمجھ مورخین اور ان کے غلام شاگردوں نے غلط پروپیگنڈہ کرنے کی وجہ سے بہت سے من گھڑت جھوٹے افسانے لکھ دیے ہیں جن سے صحیح تاریخ کا سراغ لگانے میں دشواری پیدا ہوگئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی علم ہو جائے گا کہ مغل شہزادیوں کی شادی ہوا کرتی تھیں۔ جاہل مورخین نے ہر واقع کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اپنی تحقیق کا موضوع بنا لیا ہے۔ کتاب میں یہ بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ پردہ نشین خواتین نے بڑے بڑے سورماؤں کو جنم بھی دیا اور خود بھی جواں مردی کے جوہر دکھائے علم و ادب تہذیب و تمدن اور مذہب کی پاسبانی میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں رہیں۔

خاندانی جھگڑوں کو ختم کرا کے ملک و قوم کو تباہی اور بربادی سے بھی بچایا۔

جن خواتین کی سوانح کتاب میں پیش کی جا رہی ہیں وہ شرافت النفس خدمتہ الناس

اور ذاتی ایثار و قربانی کے اعتبار سے تاریخِ ہند میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں انکے خوبصورت خصائل ہم اپنے ملک کے طبقۂ نسواں میں دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ ابھی اُمید کی کرن باقی ہے۔ کتاب کے لکھنے کا مقصد ہے کہ جدید دور کی خاتون مذکورہ خواتین کی زندگی اور کردار سے متاثر ہو کر اندھیرے سے اُجالے کی جانب لوٹ آئے۔ کتاب میں ان ہندو رانیوں کا مختصر تعارف تحریر ہے جو کسی بھی طرح مغل شہزادوں سے حسن و جمال، قابلیت اور بہادری میں ——— کم نہیں تھیں۔ اور ہند کی مایۂ ناز خواتین میں ان کا نام سنہرے الفاظ میں تحریر ہے۔ تاریخ ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے، جن کی مدد سے کتاب مکمل کی گئی ہے تمام حوالے انھیں مستند تاریخی کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ کتاب میں جن خواتین کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اپنی دانشمندی اور پاکدامنی کی ضمانت خود آپ تھیں۔

میں محترم ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، محترم جوگیندر پال، محترم تنویر احمد علوی، محترم گوپی چند نارنگ، محترم منصور احمد عثمانی، (سکریٹری اردو اکادمی دہلی)، ڈاکٹر صادق صاحب اور سید ظہیر صاحب کا ممنون ہوں کہ انھیں حضرات نے میرے دل میں اس کتاب کے لکھنے کے جذبات پیدا کیے اور اپنی نیک دُعاؤں سے میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

خُدا سے دُعا گو ہوں کہ کتاب جس مقصد کے لیے لکھی گئی ہے، آج عورت کی بگڑتی ہوئی زندگی کے لیے مفید ثابت ہو۔

محمود علی

بشکریہ نیشنل میوزیم دہلی

مغل خاندان کی نامور بیگمات
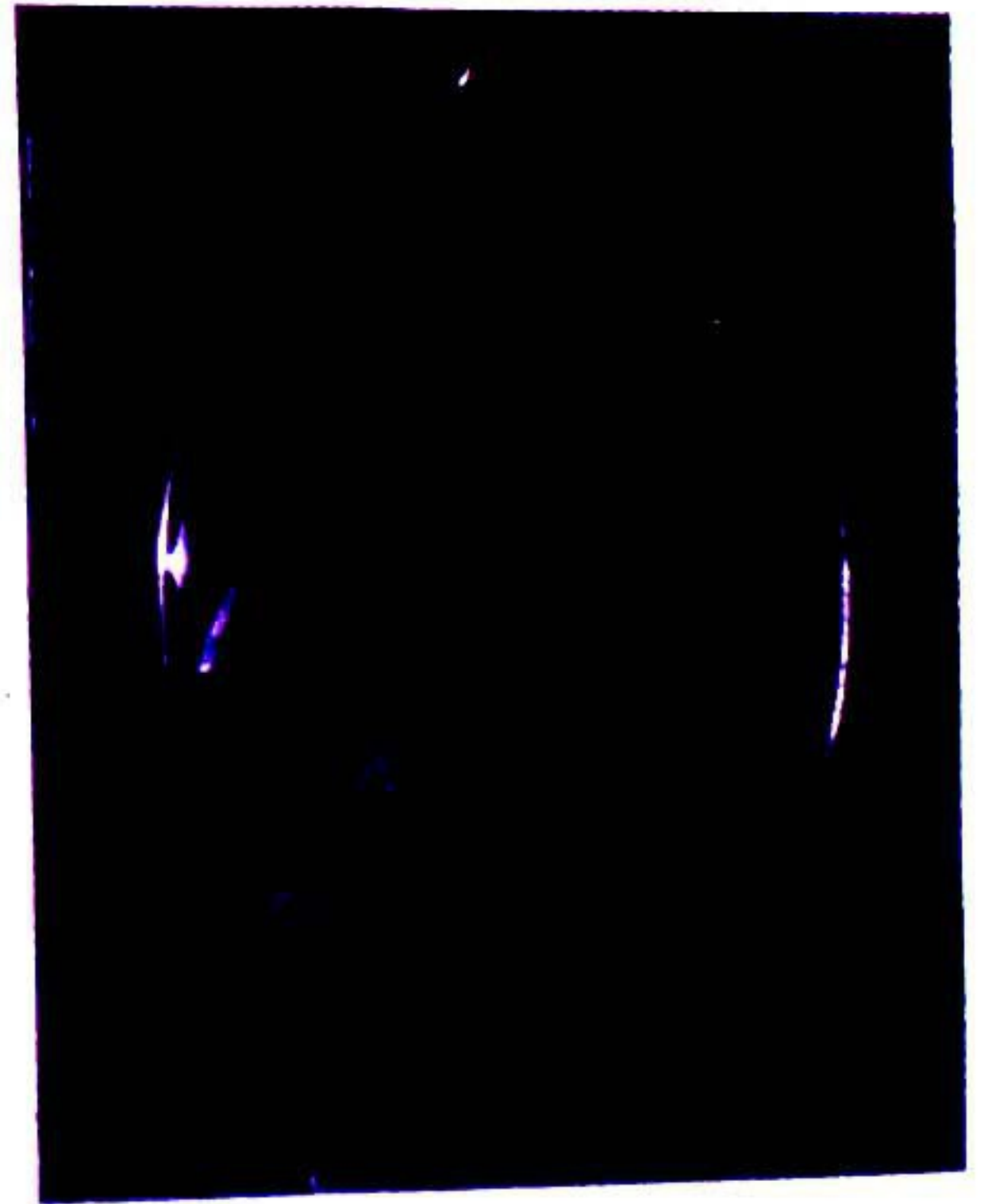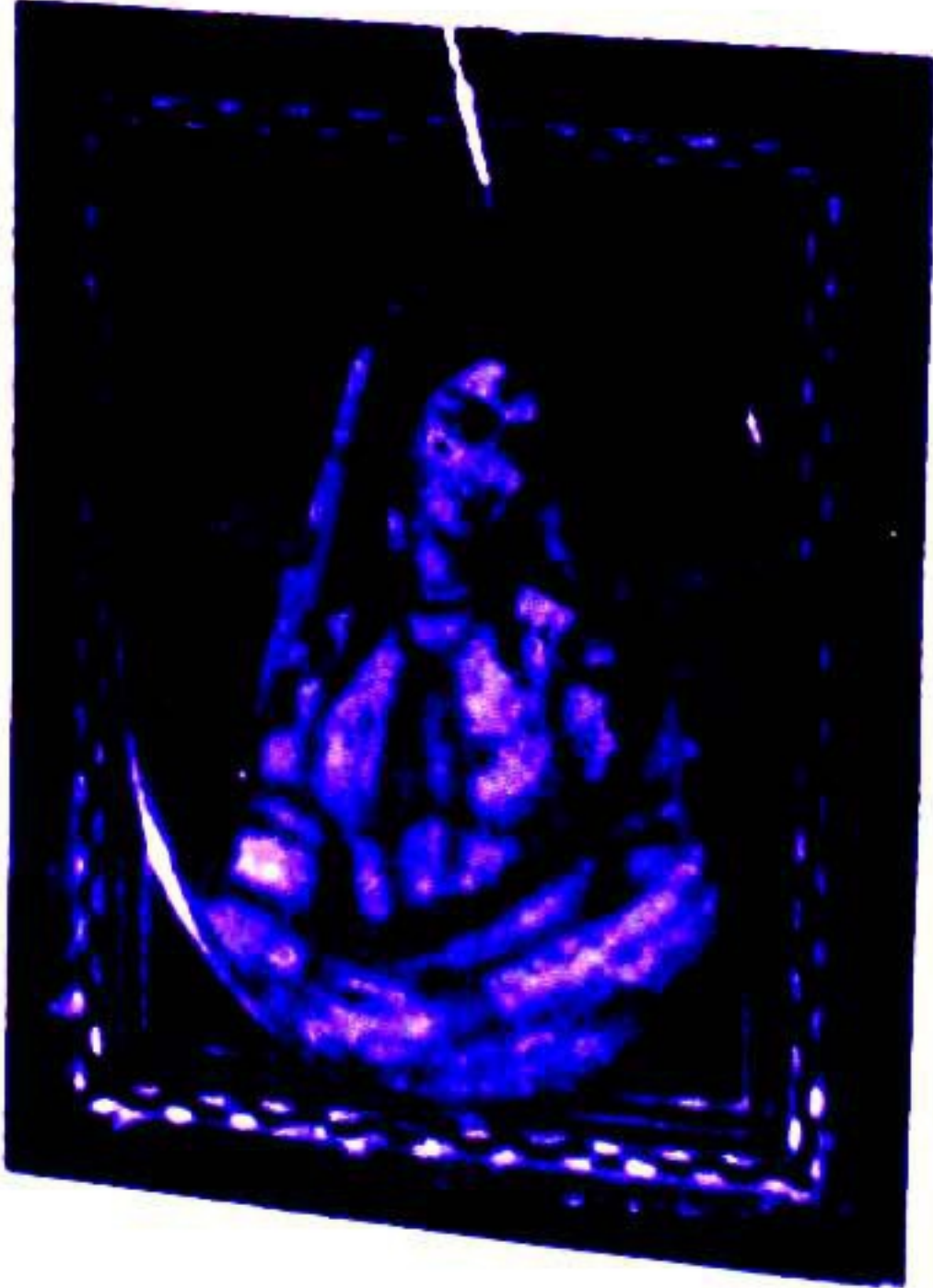
حسینہ بیگم

ذکیہ خاتون

صبیہ خاتون

سکینہ خاتون

ممتاز محل

نورالدین صاحبه

مان بائی

قمر جو رسک

شائستہ بانو

عاسیہ خاتون

نور جہاں بیگم
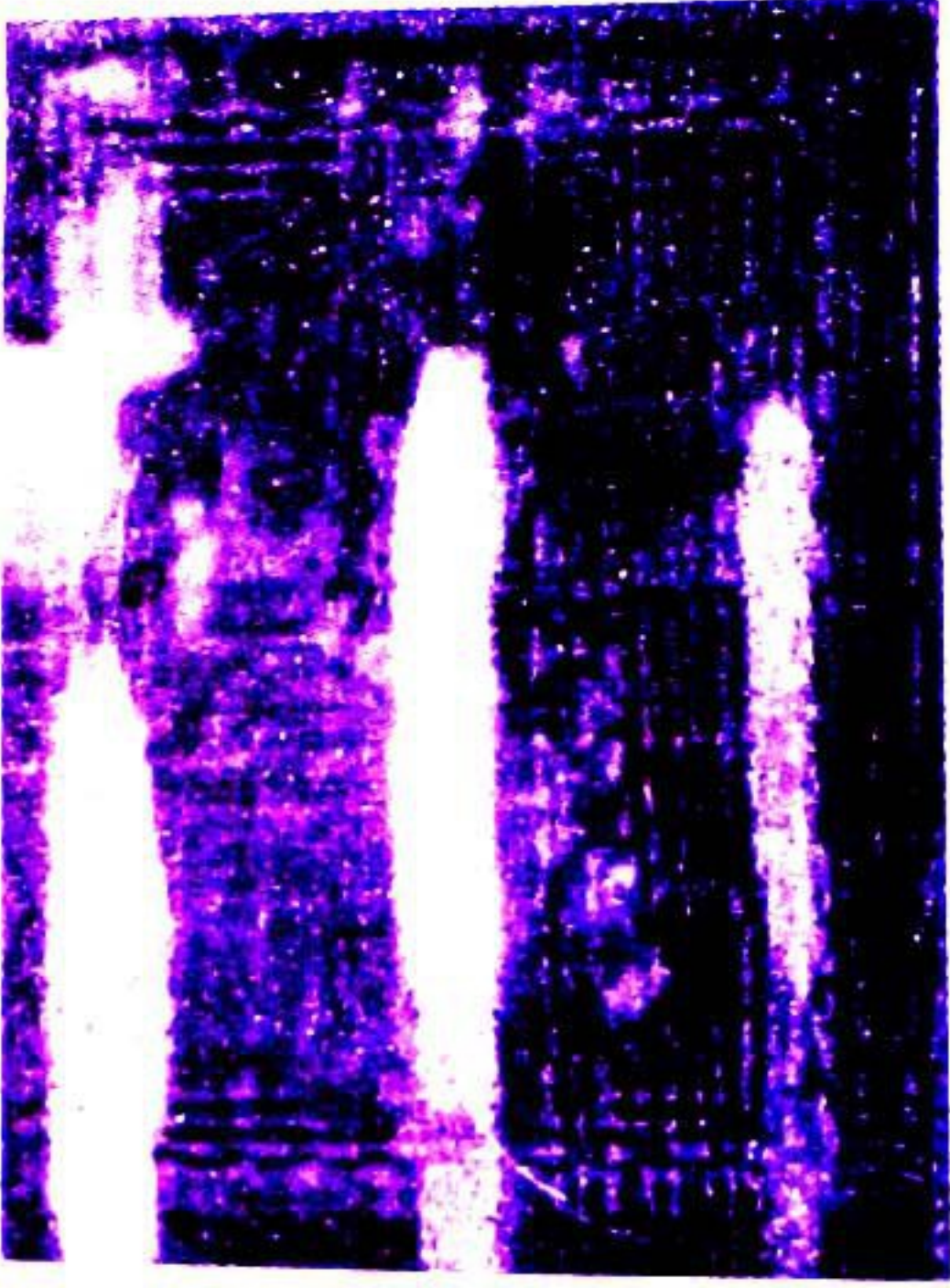
سعیدہ خاتون

عباسی خاتون

ممتاز محل

بروز بانو

سکندر جہاں

اختر جہاں

سفیہ بانو

شرف افزا بانو

انور زمانی

شہنشاہ بابر کی بیٹی ۔ گل بدن بیگم

گلبدن بیگم

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

اسلامی تمدن نے جہاں اور بہت سے احسان کیے ہیں وہاں نسوانی زندگی میں بھی انقلابِ عظیم پیدا کر کے اسے قابلِ رشک بنا دیا قرونِ وسطیٰ کی بہت سی نسوانی تحریکات اسلامی تمدن کے صدائے بازگشت ہیں اسلام نے عورتوں کے جائز حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے اس حسین لطیف کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیا ہم دیکھتے ہیں کہ دورِ تیموریہ میں بعض قدسی منش شہزادیوں نے تمدنی ترقی میں ہی نہیں بلکہ حکومت کے کام میں بھی مدد فرمائی۔

گلبدن بیگم شہنشاہ بابر کی بیگم دلدار بیگم کے بطن سے ۱۵۲۳ء کو کابل میں پیدا ہوئی۔ دلدار بیگم الملقب۔ آغاچہ ایک چغتائی خاتون آغاچہ کا اصل نام مبارک بی بی تھا منصور یوسف زئی کی بیٹی تھی۔ گلبدن بیگم ہمایوں کی ہمشیر اور اکبر اعظم کی پھوپی تھی۔ بابر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کی عمر دو سال کی تھی اور بابر کی وفات کے وقت وہ آٹھ سال کی تھی سید صباح الدین نے بزم تیموریہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۷ پر بحوالہ فہرست کتب قلمیہ فارسیہ عجائب خانہ برطانیہ لندن مولفہ ڈاکٹر چارلس ریو جلد دوم صہ ۴۴ سے مذکورہ بالا سنِ پیدائش قلمبند کی ہے۔ گلبدن بیگم کا اپنا بیان ہے کہ جس وقت حضرت فردوس مکانی کا انتقال ہوا۔ یہ فقیرہ آٹھ سال کی تھی۔ جب وہ دو سال کی تھی تو بابر کا لڑکا مرزا فاروق جو ماہم بیگم کے بطن سے۔ پیدا تھا انتقال ہو گیا ماہم بیگم ہمایوں کی والدہ اور بابر کی چہیتی بیگم تھی جب ماہم بیگم بیٹے فاروق کی موت کے بعد بہت غمگین رہنے لگی تو گلبدن بیگم کو اپنی بیٹی بنا لیا۔

گلبدن بیگم کی شادی خواجہ خضر خان مغل سے ۱۶ سال کی عمر میں ہوئی۔ گلبدن بیگم کا سگا بھائی مرزا ہندال تھا۔ بچپن میں گلبدن بیگم ماہم بیگم سے ہی وابستہ رہی ماہم بیگم بھی گلبدن کو بہت پیار کرتی تھی۔ جس وقت شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی تو گلبدن بیگم آگرہ سے لاہور اور وہاں سے کامران کے ساتھ کابل چلی گئی۔ ہمایوں کی وفات کے بعد ۱۵۵۵ء کو گلبدن بیگم کابل سے دوبارہ ہندوستان

چلی آئیں۔ اور اب یہیں رہنے لگیں۔

اعلیٰ تعلیم اور اس پر ذوق قلبی اور مذاق سلیم نے اس کی طبیعت میں وہ جوہر پیدا کیے کہ گلبدن بیگم علم الانشاء اور شاعری میں بقائے دوام کا تاج حاصل کر چکی ہے۔ وہ علم دوست اور علم پرور تھی وہ عالموں کی بہت قدر کرتی تھی۔

اقبال نامہ جہانگیری کا بیان ہے "پیوستہ ارباب نیاز و اہلِ حاجت از خوان نوال ایشاں بہرہ ور می گشتند" [۱]

گلبدن بیگم شریعت کی پابند غریبوں اور بے کسوں اور لاوارث لڑکیوں کی پرورش میں حصہ لیتی تھی اور ان کی شادی کا انتظام کرتی تھی، حاجیوں کے لیے سامان مہیا کرتی، اہل اللہ اور فقراء کے لیے وظائف بہم پہنچاتی تھی وہ ایک زبردست شاعرہ بھی تھی۔

جب جدّتِ طبع، شوخیٔ ذہانت اور واردات قلب اس کے دل میں طوفانِ جذبات پیدا کرتے تو وہ شعر کہتی تھی، اس کے شعر برق بن کر اقلیمِ دل کو ہلا دیتے تھے اور جذبات میں ہل چل پیدا کر دیتے تھے۔ اشعار اصلیت کے رنگ میں ڈوبے ہوتے تھے، اس کے کلام کا نمایاں جوہر راست و روانی ہے۔ اشعار موتیوں کی طرح چمکتے ہیں جو تصنع اور جلا کی اعانت سے بالکل مستثنیٰ ہیں؛ [۲]

گلبدن محبّت کے بغیر زندگی کو بدمزہ بتاتی ہوئی یوں ادا کرتی ہے: ؎

ہر نگارے والۂ او با عاشق خود یار نیست

تو یقیں می داں کہ ہیچ از عمر خود دار نیست

گلبدن کی شاعری میں سادگی، عام فہم الفاظ دل نشیں مضمون اور محاورہ بندی نے کلام میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ افسوس آج اس کا دیوان صفحۂ عالم سے ناپید ہے تاہم نکتہ نکتہ کا سُراغ لگا کر پیش کش اربابِ ذوق ہے [۲]

---

[۱] صہ ۲۹۱

[۲] دُختران ہند از مولانا محمد علیم الدین پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور،

"کشادِ غنچہ اگر از نسیم گلزار است
کلیدِ قفلِ دلِ ما تبسم یار است
نہ گل شناسد و نہ رنگ و بو نہ عارضِ زُلف
دل کسے کہ بہ حسن داد اگرفتار است"

گلبدن نے ہمایوں سے متعلق بہت سے واقعات تو خود آنکھوں سے دیکھے تھے اور بہت سے واقعات کی معلومات ماہم بیگم سے ہوتی رہتی تھی۔ اسی لیے گلبدن بیگم کی معروف کتاب "ہمایوں نامہ" کی بہت اہمیت ہے۔ گلبدن نے ہمایوں نامہ اکبر کے اصرار کرنے پر لکھا جو فارسی زبان میں ہے مگر چغتائی ترکی زبان کے الفاظ زیادہ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ کیوں کہ مغلوں کی زبان چغتائی ترکی تھی۔ گلبدن کے حمیدہ بانو بیگم (ہمایوں کی بیوی) سے بھی بہت قریبی اور اچھے تعلقات تھے اس لیے بہت سے تاریخی واقعات کی ذاتی اور معتبر معلومات تھی۔ تیموری شہزادیوں کی علمی بزم کی فہرست میں سب سے پہلے گلبدن کا نام ہے۔

بابر کے شہزادوں ہمایوں، کامراں ہندال اور عسکری نے علم و ادب اور شعر و شاعری کا ذوق، میراث میں حاصل کیا تھا اسی ماحول میں گلبدن بیگم نے پرورش پائی اور یہی خاص وجہ تھی کہ گلبدن بھی ترکی فارسی زبان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت رکھتی تھی اور گلبدن بیگم اعلیٰ شاعرہ اور انشاء پرواز ہوئی گلبدن بیگم کا "ہمایوں نامہ" —— ہمایوں عہد کے تمدن، معاشرتی اور تاریخی واقعات کے لیے بے مثل کتاب اور قیمتی ماخذ ہے۔ ہمایوں نامہ اکبر نامہ کی ترتیب و تدوین کے وقت بابر اور ہمایوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے لکھی گئی تھی مگر اپنی خاص خصوصیات کی بنا پر ایک اہم تالیف بن گئی۔

۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانہ میں گلبدن کا ہمایوں نامہ بالکل نیست و نابود ہو گیا تھا۔ مگر خوش نصیبی سے اس کا ایک نامکمل نسخہ کرنل جارج ولیم ہملٹن کے ذریعہ ۱۸۶۸ء میں برٹش میوزیم لندن کے کتب خانہ میں پہنچ گیا۔ ہمایوں نامہ کے ترجمہ کے حرف آغاز میں رشید ندوی صاحب نے بیباک کہا ہے کہ " غدر میں شریک ایک انگریز کرنیل جارج ولیم ہملٹن نے یہ مسودہ دوسرے

قیمتی مسودات کے ساتھ دہلی میں مالِ غنیمت کے طور پر پایا پھر ان کی بیوہ نے دوسرے مسودات کے ہمراہ برٹش میوزیم کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر چارلس ریو نے اس بیش بہا تصنیف کا تعارف اہلِ علم سے کرایا۔ ۱۹۰۲ء میں مسز اینیٹ۔ ایس۔ بیورج نے اسے حواشی و تراجم کے ساتھ مجلا کر کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کی طرف سے شائع کرایا۔ اب یہ کتاب عام ہے اور کئی علم دوست خاتون یونیورسٹیوں میں بطور نصاب رائج ہے۔ بیورج نے ہمایوں نامہ کے نسخوں کو یکجا کیا اور ایڈٹ کر کے ۱۹۰۲ء میں انگریزی ترجمہ کر کے لندن میں شائع کرایا۔

ہمایوں نامہ کے دیباچہ میں خاتون نے ہمایوں کی مفصل سوانح عمری لکھی ہے اور کتاب میں جتنے بھی بیگمات کے نام آئے ہیں سب کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ مولانا شبلی نے اس پر ایک تفصیلی ریویو لکھا ہے مولانا مرحوم نے ہمایوں نامہ کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان سے گلبدن بیگم کے عدیم المثال ادیب اور مورخ کی تحریر روشنی میں کتاب کی ادبی اور تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

ہمایوں نامہ کی انشاپردازی کے بارے میں مولانا شبلی تحریر کرتے ہیں :

"... فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزکِ جہانگیری اور رقعاتِ عالمگیری ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری اور وفائع نعمت خاں ان پر نثار کر دی جائیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس لیے چھوٹے چھوٹے فقرے سادہ اور بے تکلف الفاظ روزمرہ کی عام بول چال طرزِ ادا کی بے تکلفی ساختگی، دل کو بے اختیار کر دیتی ہے"[1]

---

[1] بحوالہ بزمِ تیموریہ جلد سوم ص ۲۳۸

ہمایوں نامہ میں عبارت کی سادگی اور طرز ادا کے بے ساختہ ہونے کی مثالیں بکثرت ہیں روزمرہ کے محاورے کتاب میں اکثر استعمال ہوتے ہیں، ملاحظہ ہو :

پائے داد : ہار جاتا ہے۔
طرفگیہا می کرد : سوخیاں کرتا ہے۔
بپائند تا یکدم راور باہم : آؤ گلے لگیں۔
خفتن شد : سونے کا وقت آیا۔
سرحضرت شوم : آپ پر قربان ہوں وغیرہ وغیرہ

گلبدن بیگم نے اس عہد کی تمدنی معاشرتی اور خانگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرکے دکھایا ہے جب وہ کسی جلسہ یا شادی کی تقریب کا حال بیان کرتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سچی تصویر کھینچ دیتی ہیں وہ عورتوں کے بارے میں بھی نئی معلومات فراہم کرتی ہیں مثلاً عورتوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی فنونِ سپہ گری میں قابلیت رکھنے کی خوبی کو بھی بیان کیا ہے عورتیں سفر اور سیر و شکار میں گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں، بعض اوقات مردانہ لباس بھی پہنتی تھیں، گلبدن بیگم نے عورتوں میں مختلف ہنر رکھنے کو بھی بیان کیا ہے جیسے : زہ گیر تراشی، چوگان بازی، تیراندازی اور ساز بجانا وغیرہ فنون میں ماہر تھیں عورتیں مردوں کے ساتھ گانے میں بھی شریک ہوتی تھیں مگر صرف خاندان والوں کے ساتھ نامحرم کے ساتھ وہ شامل نہیں ہوتی تھیں بے گانوں کے ساتھ مل کر گانے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ایران کے سفر میں گھوڑے پر سوار ہمایوں کے ساتھ اس کی ہمشیرہ بھی شریک تھی، ماہم بیگم جب کابل سے ہندوستان آئیں تو بابر خود دو کوس پیدل ان کے استقبال کو جاتا ہے گلبدن کے ہمایونامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکی نظام اور دیگر اہم معاملات میں عورتوں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

مولانا شبلی، ہمایوں نامہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :

"گلبدن بیگم اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں کہ کس واقع کو سمیٹ کر اور کس واقع کو پھیلا کر لکھنا ہے وہ واقعہ کے اثرانداز کرنے کی کیفیت اور

اس کے تاثرات سے واقفیت رکھتی ہیں۔"

قلمی نسخہ (بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) اور قلمی نسخہ دارالمصنفین مخزن الغرائب میں گلبدن بیگم کا نام شعرا، کی فہرست میں تحریر ہے لیکن دونوں تذکروں میں بیگم کا صرف ایک شعر منقول ہے اور مسز بیورج نے اس شعر کو ہمایوں نامہ کے دیباچہ میں میر مہدی شیرازی کے تذکرۃ الخواتین سے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو :

ہر پری روے او با عاشق خود یار نیست

تو یقیں می داں کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

گلبدن بیگم اپنے سگے بھائی مرزا ہنداں کی حسرت ناک موت کو یاد کر کے بار بار مندرجہ ذیل شعر پڑھتی تھی :

"اے دریغا اے دریغا اے دریغ

آفتابم شد نہاں در زیر میغ

گلبدن بیگم کے عالم نزاع میں مریم مکانی اس کے سرہانے کھڑی تھی دونوں میں بڑی محبت تھی۔ مریم مکانی گلبدن بیگم کو جیو کہہ کر بار بار پکار رہی تھی گلبدن نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور مریم مکانی کی طرف دیکھتے ہوئے یہ مصرع پڑھا ؎

" من زار لمبردم عمرت با دا ارزانی"[1]

ابتدائی دور ہی سے جبکہ سلطنت اور تہذیب و تمدن کا آغاز ہو رہا تھا مغل حکمراں شہزادوں کے ساتھ شہزادیوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے تھے۔ گلبدن بیگم کے علم و ادب کا ذوق اس بات کا ثبوت ہے اس کے علاوہ مغل بیگمات اور شہزادیوں کی تصنیفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ان کی تعلیم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمایوں نامہ اس زمانہ کی واقع نگاری کا بے مثال ثبوت ہے۔

---

[1] اکبر نامہ

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ گلبدن بیگم تاریخ نویسی کی ذمہ داری سے کس قدر واقف ہے،" گلبدن بیگم کی تحریر میں صداقت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ تحریر کرتی ہیں کہ فلاں واقع میں نے فلاں شخص سے سُنا ہے اپنے چشم دید واقعات کو پورے یقین کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ یورپ کے مورخین روایت کے سلسلے کو زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کرتے بہت ہی مختصر بیان کرتے ہیں جبکہ ایشیائی مورخین صرف جنگ و جدل کو پوری تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور عرب مورخین کا مذاق روایت کے سلسلہ کو آخر تک پہنچانے کا ہے۔ عورت ہونے کی وجہ سے گلبدن بیگم نے معاشرتی اور تمدنی زندگی سے متعلق واقعات کو تحریر کرنا ہی اپنا مذاق بنایا اور جنگ و جدل میں کم دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

گلبدن بیگم نے حمیدہ بانو کی ہمایوں سے شادی کا واقع بڑی دلچسپی سے بیان کیا ہے کہ حمیدہ بانو بیگم بہت مشکل سے شادی کے لیے راضی ہوئی تھی۔ حمیدہ بانو بیگم سے جب شاہ بیگم نے کہا کہ آخر کسی کے پلّے سے تو بندھے گی تو کہنے لگی کہ ہاں اِس سے بندھوں گی جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچے نہ کے اس سے کہ میرا ہاتھ اس کے دامن تک بھی نہ پہنچے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شادی کے معاملے میں پوری آزادی تھی خواتین بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں وہ نامحرم سے پردہ کرتی تھیں اس بیان سے اس زمانہ کا پردہ شکن گروہ مایوس ہو جاتا ہے، اس زمانہ میں بغیر نقاب اور برقع کے عورتیں باہر نہیں جاتی تھیں ہمایوں نے نکاح سے پہلے جب حمیدہ بانو بیگم کو بلایا تو بیگم نے کہا آدابِ سلطنت کے لحاظ سے ایک دفعہ میں بادشاہ کو سلام کے لیے جا چکی ہوں دوبارہ جانا محرم کے سامنے جانا ہے چنانچہ حمیدہ بانو بیگم کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"دیدن بادشاہان یک مرتبہ جائز است۔
دوم مرتبہ دیگر نامحرم است ہی نمی آیم"

گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیائی سلطنت میں بادشاہ نہ صرف تخت پر بلکہ خانگی زندگی میں بھی بادشاہ ہوتا تھا۔ اگر دربار میں بادشاہ کا بچہ بھی جاتا تو وہ

باپ کی گود میں نہیں بلکہ شہنشاہ کے دربار میں جاتا تھا۔ یہ بادشاہ پرستی اور شہنشاہ پرستی کی آخری حد ہے اور قومی زندگی کی یہ آخری علامت ہے" لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ حالت نہ تھی، بابر اور ہمایوں اسی طرح اپنے عزیز و اقارب اور قریب بھائیوں سے اسی طرح ملتے تھے جس طرح ایک آدمی اپنے پیارے عزیزوں سے ملتا ہے۔

گلبدن نے اس طرح کے واقعات کو بڑی دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کہتے ہیں کہ "ایسے موقعوں کے بیان سے گلبدن کے قلم سے آبِ حیات ٹپکتا ہے"۔

ہمایوں کی بیماری کے موقع پر جب گلبدن بیگم بھائی کی تیمار داری کو جاتی تو یوں بیان کرتی ہے:

"ایں حقیر ہمراہ ہمشیر با ملازمت آں حضرت فرشتہ خصال رفتہ کردم ہرگاہ آں حضرت بہوش خویش می آمدند از زبان درافشانِ خویش پرسش می فرمودند کہ خواہران خوش آمدید بپائیدنا یکدگر را در یابیم کہ شمارا ور نیافتہ ایم"۔

ایک اور موقع پر ہمایوں گلبدن سے کہتا ہے گلبدن کی ہی زبانی سنیئے:

"ایں حقیر را دیدند و فرمودند کہ اول ترانشا ختم از برائے آنکہ وقتہ کہ لشکر ظفر اثر بہ گور بنگالہ کشیدہ بودم طاقی پوش بودی"۔

گلبدن کے ہمایوں نامہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ترکی زبان کی جگہ فارسی نے لے لی۔ اور فارسی زبان کو فروغ ملنے لگا۔ ہمایوں نامہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں شہزادیاں ٹوپی پہنتی تھیں۔ مرزا کامراں کے اندھا کرنے اور ہمایوں کی رحم دلی کو بھی گلبدن نے بڑے صاف طور سے بیان کیا ہے: ہمایوں نامہ کے اردو ترجمہ کے دیباچہ میں عثمان حیدر تحریر کرتے ہیں کہ:

"ہمایوں نامہ کی تاریخی حیثیت و اہمیت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے"۔

اس کتاب کی تحریر بھی مصنفہ کی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے لکھنے والی ایسی خاتون ہے جو ان عظیم ہستیوں کے ساتھ شامل ہے جن کے کارناموں سے صفحاتِ تاریخ درخشاں ہیں، ان کا دائرۂ علم باہر کے واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس اندرونی دائرہ میں بھی قدم رکھتی ہے جس سے اکثر مورخین نا آشنا ہیں اور مورخین کی طرح وہ باہر کے اسٹیج پر نظر نہیں رکھتی بلکہ پس پردہ بھی دیکھ سکتی ہیں، جنگ اور فتح و شکست کے حالات بہت سی تواریخ میں موجود ہیں۔ ہمایوں نامہ کی خوبی ان واقعات کے بیان سے نہیں بلکہ اس کے قابل قدر وہ قصص میں جو ہمیں ان کی شخصیت ان کی عادات، ان کے احساسات کی ایسی جھلک دکھاتے ہیں کہ جس سے ان کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے گلبدن بیگم کی کتاب میں ہمایوں بادشاہ اور بابر بادشاہ اور ان کے متعلقین کی بابت بہت سی روزمرہ کی باتیں ہیں جو خاص طور سے ہماری دلچسپی کا باعث ہیں اور جن کی وجہ سے ہم ان پر اوصاف ہستیوں کو زیادہ طرح سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں"۔ انگریزی زبان میں ایک مثل اس مفہوم کی ہے کہ اگر ہم کسی شخص کو بہت اچھی طرح جانتے ہوں یعنی ہم اس کی معمولی معمولی باتوں سے بھی بخوبی واقف ہوں تو ہمارے دل میں ضرور اس کے لیے ایک تحقیر سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات ایک حد تک صحیح ہوتی ہو مگر اس کے برعکس ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب تک ہم کسی شخص کو بخوبی نہیں جانتے ہوں اور اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں جو ہمایوں نامہ میں پائی جاتی ہیں ہمارے لیے خاص دلچسپی کی ہیں اور ہمارے دل میں ان اشخاص کی جانب جو اس کتاب میں مذکور ہیں ایک قسم کا انس پیدا کر دیتی ہیں مثال کے طور پر بیگہ بیگم ہمایوں بادشاہ کو صبح نماز کے لیے بیدار کرنا اور بے محل شکایتوں کا دفتر کھولنا، کھانے پر مرزا سلیمان کی ناشائستہ حرکت مرزا کامران کی سادہ لوحی اور حرم بیگم کے نام خط وغیرہ وغیرہ۔

گلبدن کے ہمایوں نامہ میں ہندوستانی باشندوں اور یہاں کے رسم و رواج کا ذکر نہیں

لہ دیباچہ ہمایوں نامہ صہ ۱۲

گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ کے آغاز میں اپنے والد بابر فردوس مکانی (بادشاہ بانام) کا ذکرِ خیر کرتیں ہیں۔ بابر کے دشمنوں کا ذکر بھی کیا ہے تین بار سمرقند کو فتح کرنے کے بعد بابر اپنے آبائی وطن کابل واپس چلے جاتے ہیں۔ گلبدن نے سلطان ابراہیم اور رانا سانگا کی شکست کو بھی بیان کیا ہے۔ آگرہ کی مختلف عمارات کا بھی ذکر کرتی ہیں، خواجہ کلاں کے ہاتھ بیگمات کو کابل تحائف کا بھیجنا، ماہم بیگم کا کابل سے ہندوستان آنا۔ ان کے ساتھ گلبدن بیگم بھی ہندوستان آئی، بابر کے انتقال، ہمایوں کی بیماری، دھول پور اور دیگر مقامات کی سیر یہ سب باتیں تو خود یاد تھیں۔ کچھ لوگوں سے معلوم کر کے گلبدن بیگم نے لکھا ہے نوی طلسم اور مرزا ہندال کی شادی کی تفصیل ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگ ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم کی شادی ۱۵۴۰ء میں ہمایوں کا سندھ اور ایران کا رُخ کرنا گلبدن کا مرزا کامران کے ساتھ کابل واپس جانا، سندھ میں ہمایوں سے بادیہ پیمائی ۱۵۴۵ء میں ایران سے ہمایوں کا واپس آنا اور کابل پر دوبارہ قبضہ کرنا۔ مرزا کامران کی غداری سے مرزا ہندال کا ۱۵۵۱ء میں قتل۔ بھائی کی شہادت صدمہ کا اسے بہت ہی دردناک انداز میں ذکر کیا ہے۔ کامران نے ۲۰ نومبر ۱۵۵۱ء کو ہمایوں کی سپاہ پر شب خون مارا تھا جس میں ہندال مارا گیا۔ گلبدن بیگم لکھتی ہے کہ: "یہ نوبتاؤ کہ میرے شوہر اور بیٹے کو اس شب خون میں کیوں نقصان نہیں پہنچا اور یہ بجلی میرے بھائی پر ہی کیوں پڑی" کتاب کے آخر میں کامران کی گرفتاری کا ذکر ہے اور یہی تحریر ختم ہو جاتی ہے اور باقی اوراق غائب ہیں۔

گلبدن نے اکبر کے پاس دو مرتبہ جانے کا ذکر کیا ہے ایک بار سلیمہ سلطان کے ساتھ اکبر سے سلیم کی سفارش کے لیے اور ایک بار حمیدہ بانو بیگم کے ساتھ تحائف کے سلسلے میں۔

گلبدن بیگم بڑی سخی فیاض طبیعت خاتون تھی اس نے بہت سے خستہ حال لوگوں کو خوشحال کر دیا تھا۔ وہ بہت ذہین اور نیک خاتون تھی وہ بڑی حساس اور فرض شناس تھی اور گھریلو معاملات کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی۔ گلبدن کی کتاب ہمایوں نامہ اپنی گواہ خود آپ ہے اس کے سوا کسی دوسرے مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

گلبدن بیگم کی یہ بلند حوصلہ اور آزاد بیانی قابل صد داد اور ستائش ہے ایسی خواتین خاندان ملک ملت اور قوم کے لیے باعثِ نازش و افتخار ہوتی ہیں انھیں کی بدولت قومیں

تھا جو علمائے ظاہرین کے نزدیک گناہ کر رہا تھا، اس وقت ہندوستان پراگندہ ہو رہا تھا گلبدن بیگم چوں کہ دین دار تھی اور مذہب کو سیاست سے بہت ہی بالاتر سمجھتی تھی اس لیے وہ دربار کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھتی رہتی تھی۔ گلبدن نے اکبر کو بار بار سمجھایا مگر اکبر پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس لیے گلبدن کا رسوخ دربار سے کم ہو گیا۔

سمرقند کی زبان ترکی تھی اور بابر کا زیادہ تر وقت سمرقند میں گزرا اس لیے اس نے اپنی تزک ترکی زبان میں لکھی اور گلبدن کا زیادہ تر وقت کابل میں گزرا جہاں کی زبان فارسی تھی اس لیے گلبدن نے ہمایوں نامہ فارسی زبان میں لکھا اسی وجہ سے ہندوستان میں گلبدن کے ہمایوں نامے کے بعد فارسی زبان کا رواج بڑھتا چلا گیا۔ اور چغتائی زبان ترکی پر فارسی غالب آتی چلی گئی۔ ہندوستان میں بھی فارسی زبان کے رواج کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

بابر بادشاہ اپنے والد کی جانب سے امیر تیمور کے بیٹے میرن شاہ کی نسل سے اور والدہ کی طرف سے چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی کی نسل سے تھے دونوں طرف سے حسب ونسب اعلیٰ رکھتے تھے اس طرح گلبدن بیگم کی رگوں میں بھی تیموری اور چنگیزی خون شامل تھا۔

گلبدن بیگم کے شوہر خواجہ خضر خاں کے والد امین خواجہ بھی والد کی طرف سے حیدر مرزا دوغلات کی نسل سے تھے جن کا چغتائی اعلیٰ نسب سے تعلق تھا۔ اپنی شادی کا اشارہ گلبدن نے اس طرح کیا ہے کہ جب ہمایوں بادشاہ بنگال کی مہم سے واپس آئے تو گلبدن بیگم کو نچک قصابہ پہنے دیکھ کر شادی ہونے کا اندازہ کر لیا۔ کیوں کہ نچک قصابہ ایک خاص وضع کا رومال ہوتا ہے جس کو لڑکیاں شادی کے بعد ہی پہن سکتی تھیں وہ اپنے خاوند کا ذکر کرتے ہوئے بہت حجاب کرتی تھیں اور انھیں اپنے ہاتھ سے خط لکھنا بھی معیوب سمجھتی تھیں مگر اس زمانے کی عورتوں میں بہت سی باتیں روشن خیالی کی تھیں جو آج کی عورتوں میں نہیں۔ اس زمانے میں عورتیں بہت سے فنون میں ماہر ہوتی تھیں سیر و سفر، شہسواری، تیراندازی، غلیل چلانا، چوگان سازی وغیرہ۔ میں مردوں کی طرح مہارت رکھتی تھیں۔ پردہ کا رواج مغلوں میں ہندوستان آنے کے بعد پختہ ہوا۔ سمرقند اور کابل میں پردہ کا رواج کم تھا۔

ملتا ہے اور نہ گلبدن بیگم نے ان کے بارے میں اپنی کوئی رائے ظاہر کی ہے کیونکہ ہمایوں نامہ صرف ہمایوں بادشاہ اس کے متعلقین اور رفقاء تک محدود ہے اور دیگر یہاں کی باتوں کا کوئی تعلق بھی نہیں دکھائی دیتا پھر بھی گلبدن نے ہماری ہندی زبان کے الفاظ کئی جگہ استعمال کیے ہیں جیسے۔ چھپر کھٹ، (چھپر کھٹ پاتر (نریا) گنواران (گنوار) وغیرہ وغیرہ۔

گلبدن بیگم کو قدرت نے حسن سیرت کے ساتھ حسین صورت بھی بخشی تھی۔ اپنے زمانے کی عورتوں میں سب سے زیادہ ذہانت علمیت و کاوت رکھتی تھیں ماہم بیگم اور بابر بادشاہ اور سب بھائی بہن گلبدن بیگم کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے اور سب بے حد لاڈ پیار کرتے تھے وہ بچپن سے ہی بڑی ہونہار تھی۔ تیمارداری میں گلبدن خاص ملکہ رکھتی تھی۔۔۔ مرزا کامران نے اپنی بیماری کے وقت گلبدن بیگم کو ہی اپنے ہمراہ رکھا، وہ ہمایوں کی طرفدار تھی، جبکہ ہنداں اس کا سگا بھائی ایک بار جب مرزا کامران سے ناراض ہو کر بیگمات کو قید کیا تو گلبدن بیگم کو قید نہیں کیا گیا۔ گلبدن بیگم نے ہمایوں سے ۔ تیموری شہزادیوں اور بیگمات کے بارے تعارف کرایا ہے۔ بیگمات کا ہمایوں سے گلبدن بیگم کے متفرق اشعار کے ساتھ اس کی فن شاعری کا پتہ چلتا ہے۔

گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ چنگیزی قانون بہادری اور قابلیت پر تھا نہ کہ عمر میں چھوٹے بڑے ہونے پر چنگیزی قانون فوقیت پر منحصر تھا اس قانون کا اثر مغل شہزادوں پر دکھائی دیتا ہے کیوں کہ تیموری اور چنگیزی خون کا رشتہ مغلوں میں شامل تھا۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ پرانے لوگ اپنی عمر کے اول وقت کی باتیں زیادہ یاد رکھتے ہیں اور موجودہ واقعات کو بھولتے رہتے ہیں۔

گلبدن کے ہمایوں نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے اول وقت کی زیادہ تر گلبدن نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر بیان کی ہیں اور باقی باتوں کو دوسروں سے معلوم کر کے یا سُن کر تحریر کیا ہے۔

اکبر پر شیخ مبارک کا بہت اثر تھا وہ اس وجہ سے ایسے ایسے افعال کا ارتکاب کر رہا

ہنستی ہیں انھیں کے ذریعہ مذہب و ملت کا نام روشن ہوتا ہے انھیں کی بدولت بخت خوابیدہ جاگ اٹھتے ہیں اور ادبار و نکہت کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور شجر امید بار آور ہوتا ہے۔"[1]

حمیدہ بانو بیگم کا جواب کہ "میں تو اس کے ساتھ شادی کروں گی جس سے ہمسری ہو سکے۔ اور جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے کہاں بادشاہ جم جاہ اور کہاں غریب بیکس لڑکی" حمیدہ بانو بیگم کا یہ جواب پردہ ورجماعت کے حق میں تازیانۂ عبرت ثابت ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس نے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ اسلامی احکام سے مقابلہ میں بادشاہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا اس روشنی اور ترقی کے زمانے میں جبکہ تمام ممالک تعلیم مغرب اور تمدن نو کے نور سے منور ہو رہا ہے۔ یہ بات نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے میں بھی عورتوں کو شادی بیاہ کے معاملے میں مکمل آزادی تھی۔

آخری وقت جب حمیدہ بیگم نے کہا جیو (بڑی بہن) میری عزیز از جان جیو قربانت شوم۔ ذرا آنکھ کھولو بیگم نے آنکھ کھولیں اور مغموم عزیزوں کا جھرمٹ اپنے گرد پا کر رونے لگیں اور دھیمی آواز میں کہا اچھا خدا حافظ میں جاتی ہوں تم زندہ رہو، اکبر نے گلبدن بیگم کی میت کو کندھا دیا۔

فروری ۱۶۰۳ء میں بمقام آگرہ میں اس جہاں فانی سے جدا ہو گئیں۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ اکبر قبرستان تک میت کے ساتھ گیا اور اس وقت گلبدن بیگم کا خرقا موجود نہیں تھا اس لیے اکبر نے میت کو قبر میں اتارا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

[1] دختران ہند از مولانا محمد علم الدین ص ۴۰۔ ۴۱

گل رُخ بیگم

گُل بدن بیگم جو کہ بابر کی بیٹی اور گل رُخ کی بڑی ہمشیر تھی اپنی تصنیف "ہمایوں نامہ" میں اس عہد کے تمدنی معاشرتی اور خانگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر کے دکھایا۔ ہے۔ ہمایوں نامہ میں گلبدن بیگم نے شاہی خاندان کی شہزادیوں اور بیگمات کے حالات کو بھی بڑے سلیقہ سے قلمبند کیا ہے۔

مولانا شبلی نے ہمایوں نامہ کی خصوصیات کو اپنے ریویو میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور ہر بات کو صاف طور سے بیان کیا ہے کہ تیموری شہنشاہوں نے شہزادوں کے ساتھ شہزادیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ یہ ہی ان کی علم دوستی اور حسنِ مذاق کا نمایاں ثبوت ہے۔

گُل رُخ بیگم ایک اعلیٰ ادیب، اعلیٰ شاعر، اعلیٰ انشاء پرداز تھی بابر کی بیٹی اور گلبدن بیگم کی ہمشیر تھی۔ گل رُخ بیگم کی ولادت صالحہ سلطان بیگم کے بطن سے ہوئی بابر کی یہ بیٹی بھی علم و ادب اور شعر و شاعری میں بے حد ذوق و شوق رکھتی تھی۔

اپنی معروف تصنیف "صبح گلشن" میں نواب حسن خاں گل رُخ بیگم کا مندرجہ ذیل ذکر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"یہ گل رُخی روئی و سلیقۂ شاعری سر آمد زمرۂ نسواں غنچہ دہانش بہ نسیم اشعار لطیف می شگفت۔ صبح گلشن، ریاض الشعراء، مخزن الغرائب میں، گل رُخ بیگم کا مندرجہ ذیل شعر منسوب تحریر ہے۔

ہیچ کہ آں شوخِ گلِ رُخسار بے اغیار نیست
راست بود دست آنکہ در عالم گل بے خار نیست

مغلوں کے ابتدائی دور میں جو سلطنت اور تہذیب و تمدن کا آغاز تھا ایسے وقت میں گل بدن بیگم، گلرُخ بیگم اور دیگر بیگمات کے علم و ادب کے ذوق کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

اور معلوم ہوتا ہے تیموری شہزادیاں ——— علم کے میدان میں شہزادوں سے پیچھے نہیں تھیں۔ انھیں بیگمات نے شریفانہ مسلم تہذیب وتمدّن کی نگہبانی بھی کی اور لطیف زبان کے ذریعہ ادبی ذوق کو بھی پورا کیا۔ انھیں بیگمات نے ہندوستانی نسوانی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر کے اسے قابلِ رشک بنا دیا ہے۔

گل رُخ بیگم حسین وجمیل شہزادی تھی نیک سیرت خاموش طبیعت خاتون تھی مطالعہ کا بے حد شوق تھا بابر اسے بہت پیار کرتا تھا۔

اس حسن پری شہزادی کو اللہ نے اوصافِ حمیدہ عطا کیے تھے شعروادب میں بے پناہ ذوق رکھتی تھی شاعری کا شوق تو تمام مغل شہزادیوں اور بیگمات کو ورثہ میں ملا تھا۔ شاہی حرم کے علمی وعملی ماحول نے بیگمات کو اہلِ قلم بنا دیا تھا۔

جہاں آرا بیگم

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی دوسری چہیتی بیٹی تھی حورالنسا، جہاں آرا بیگم کی بڑی ہمشیر تھی جس کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ جہاں آرا بیگم ۲۱ صفر سنہ ۱۰۲۳ھ مطابق یکم اپریل سنہ ۱۶۱۴ء کو بدھ کے دن ارجمند بانو بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی یہ تاریخ پیدائش بادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۲۹۱ اور عمل صالح حصہ اول صفحہ ۸۰ منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۲۷۸ میں درج ہے مگر ڈاکٹر چارلس ریو ۲! کی فہرست مخطوطات فارسی در موزۂ برطانوی میں جہاں آرا بیگم کی ولادت کی تاریخ سنہ ۱۰۲۲ھ قرار دیا ہے مگر یہ تاریخ غلط ہے اور سنہ ۱۰۲۳ھ تاریخ پیدائش صحیح ہے۔

جہاں آرا بیگم نے شاہجہانی عہد کے اعلیٰ علمی فضا کے گہوارہ میں پرورش پائی اور شہزادی کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ ستی النسا، جو قرآن حافظ اور علم طب، علم قرأت، تجوید اور ادب شناسی میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی ستی النسا، خانم حکیم رکنا کاشی کے بھائی نصیرا کاشی کی بیوی تھی اور خانم کے بھائی ملک الشعراء طالب عاملی تھے ستی النسا، خانم ممتاز محل کی مہر دار بھی تھی، شہزادی جہاں آرا بیگم کی تعلیم و تربیت کا کام ستی النسا، خانم کو سپرد کیا گیا۔ خانم کا روضہ تاج گنج آگرہ میں شاہجہاں نے خود اپنے خرچہ سے تعمیر کرایا۔ مآثر الکرام کا بیان ہے کہ خانم نے شہزادی کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ شاہجہاں عہد کا معروف سیاح ٹیوانیر رقمطراز ہے کہ :

> "اس میں شک نہیں کہ جہاں آرا بیگم ایسی خاتون ہے جس میں تمام اوصاف اور خوبیاں پائی جاتی ہیں یہ وہ خاتون ہے کہ اگر تمام دنیا کی سلطنت اس کے ہاتھ میں دیدی جائے تو وہ نہایت عمدگی کے ساتھ اس پر حکومت کر سکتی ہے۔"[1]

مسٹر ڈبلو بیل لکھتے ہیں کہ :

---

[1] بحوالہ جہاں آرا بیگم از محبوب الرحمٰن کلیم

جہاں آرا بیگم شاہ جہاں کی قبر پہ

"جہاں آرا بیگم عورتوں کی تاریخی دنیا میں بلحاظ عصمت و حیا کی بے مثل شہزادی گزری ہے اور تمام کتب تاریخ اور ملکی راگوں میں ایک نامور خوش اخلاق فاضل اور خوبصورت بیگم مشہور ہے۔ جہاں آرا کا نام ہمیشہ صفحات تاریخ کو آراستہ رکھے گا اور قیامت تک اطاعت والدین اور ادائے فرض منصبی میں ضرب المثل رہے گی۔"[1]

شاہ جہاں اور ممتاز محل جہاں آرا کی بڑی قدر دانی کرتے تھے شہزادی اپنے عہد کی ایک معروف شاعرہ اور مصنفہ تھی۔ جہاں آرا نے ۲۶ سال کی عمر میں "مونس الارواح" لکھی اس معروف تصنیف میں شہزادی نے خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے سلسلے کے اکابرین کے حالات بہت ہی عقیدت مندی، ہوشیاری اور بڑے احتیاط سے قلمبند کیے ہیں۔ حقیقت میں یہ کتاب شہزادی کی مذہبی اور صوفیانہ ذوق کی صحیح آئنہ دار ہے۔ بیگم نے کتاب میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ:

"احوالِ بزرگاں را کہ مقربان درگاہ صمدیت انداز کتب و رسائل معتبرہ با احتیاط تمام بیروں آوردہ بقید تحریر آوردہ شد و اعتقاد ایں ضعیفہ انچہ دریں رسالہ ثبت گردیدہ صحتِ تمام دارد و امید کہ خوانندگاں را فیض و بہرہ مانتمام از حاصل آید۔"

کتاب کے مطالعہ سے بیگم کی طرزِ تحریر اور بزرگانِ دین سے عقیدت کا علم ہوتا ہے حقیقت میں بیگم بزرگانِ دین کا بے پناہ ادب و احترام کرتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم مونس الارواح کی طرز تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کتاب کی عبارت بہت صاف اور شستہ ہے یہ مصنفہ کی طرز انشا کی خوبی ہے جو قابل تعریف ہے، اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں ہے جس کو بیگم نے عاقل خاں (مشہور خوشنویس) سے لکھوایا تھا اور تمام کتاب طلائی نقش و نگار اور زریں افشاں سے مزین کرایا تھا۔ یہ نسخہ بیگم کی عمر کے ۴۶ ویں سال میں لکھوایا تھا۔ پوری کتاب ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

---

[1] بحوالہ جہاں آرا بیگم از محبوب الرحمٰن کلیم ص ۲۶

مولانا شبلی مرحوم نے اس کتاب کو بڑی رقم میں خریدا تھا۔ اس کتاب میں خطاطی کے اعلیٰ نمونے بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب پیرس کی نمائش ۱۹۱۱ء میں بھیجی جا چکی ہے۔

جہاں آرا نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذکر کی ابتدا مندرجہ ذیل اشعار سے کی ہے:

"آں شہنشاہِ جہانِ معرفت
ذات او بیروں ز ادراک وصفت
خسروِ ملک فنا بے تخت و تاج
از خود بحر از غیر خود بے احتیاج
غرقِ بحرِ عشق از صدق وصفا
از خودی بیگانہ با حق آشنا
کرد مرغ ہمتش ز اوج کمال
بیضۂ افلاک را در زیرِ بال
اخترِ برج سپہرِ لم یزل
گوہرِ درج کمالِ بے بدل
آں معین دین و ملت بے نظیر
فارغ از دُنیا بملکِ دیں امیر
در ثنائے او زبانم را چہ حد
فیض او باید کہ فرماید مدد"

خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر پہنچ کر بیگم اس طرح عقیدت مندی کا اظہار کرتی ہے:

"می گوید فقیرہ حقیرہ جہاں آرا اے چوں از یاوری بخت وفیروزی طالع از دار الخلافہ اکبر آباد در خدمت والد بزرگوار متوجہ خطۂ پاک حضرت اجمیر بے نظیر شدم از تاریخ ہژدہم ماہ شعبان المعظم سنہ یکہزار و پنجاہ سنہ ہجری ... عجب شامی دیدم آنجا کہ بہتر از صبح بود اگرچہ اخلاص ومحبت ایں فانیاں تقاضائے

آں نمی کرد کہ بایں قسم جائے متبرک پرفیض گوشۂ عافیت رفتہ باز بخانہ بیاید اما چہ چارہ "

رشتہ گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اگر اختیاری داشتم ہمیشہ در روضۂ حضرت کہ عجب گوشۂ عافیت است و من عاشق گوشۂ عافیت ہستم بسری بردم و با سعادت طواف نیز مشرف می شدم ناچار بچشم گریاں و دلِ بریاں بصد ہزار افسوس ازاں درگاہ رخصت شدہ بخانہ آمدم و تمام شب طرفہ بیقراری در من بود "

یہ عبارت ۱۰۵۳ھ میں بطور ضمیمہ لکھی گئی۔ صوفیائے کرام سے عقیدت کا یہ عالم ہو گیا کہ شہزادی جہاں آرا کا زیادہ تر وقت ان کے حالات کے مطالعہ میں ہی گزرنے لگا۔ مونس الارواح میں خود تحریر کرتی ہیں کہ :

... " ایں ضعیفہ راچہ از ادائے فرض و واجبات و تلاوت قرآن مجید ہیچ امرے شریف تر از ذکر حالات و مقالات اولیاء کرام قدس اللہ از واحہم نمی داند بنا براں خلاصۂ اوقات خود را بمطالعۂ کتب و رسائلے کہ مشتمل بر احوال سعادت مآل بزرگانِ دین و اکابر صاحب یقین ست صرف می نماید "

سنہ ۱۹۱۳ء میں انگریزی خاتون نے جہاں آرا کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس کے دیباچے میں خاتون تحریر کرتی ہے کہ : " . . .

... جب وہ آگرہ کے قلعہ کو دیکھنے میں مصروف تھی کہ ثمن برج کے ایک پتھر کے نیچے سے کچھ مسودے ملے، مسودے کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ جہاں آرا کی خود نوشتہ تحریریں ہیں جن کو جہاں آرا نے شاہجہاں کے ساتھ قید تھی اسی لیے اس نے قید کے زمانے میں اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات لکھنے شروع کیے اور ان کو ثمن برج کے نیچے چھپا دیا، جب پتھر خستہ ہو جائے گا تو یہ تحریر

لوگوں کے ہاتھ آئے گی جن سے ان کے اصلی خیالات و جذبات و حالات روشن ہوں گے"۔

تحریر میں روانی اور تمثیلی رنگ بہت غالب ہے اور اسلوب بیان بہت ہی دلکش اور مؤثر ہے۔ بقول سیّد صباح الدین کہ :

"... میں نے اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا اور اس کو سراسر جعلی اور نقلی پایا یہ محض ایک نئے اور دل نشین انداز میں جہاں آرا بیگم کے اخلاق اور کردار کو مسخ کر کے دکھانے اور عالمگیر کی ذات سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش میں لکھی گئی ہے" کتاب میں بعض لغو اور لاطائل واقعات پیش کیے گئے ہیں ... مثلاً جہاں آرا راجپوتوں کی مدح ہے وہ ایک راجپوت سردار پر عاشق ہوگئی وہ شادی اس لیے نہیں کر سکتی کہ اکبر نے قانون بنا رکھا تھا کہ مغل بادشاہوں کی لڑکیاں رشتہ ازدواج سے محروم ہیں چنانچہ جہاں آرا چھپ چھپ کر اپنے محبوب راجپوت سے ملتی ہے۔ عشق و محبت کی باتیں کرتی ہے اور اپنی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس کو تحفے دیتی ہے جب دارا اور نگ زیب میں خانہ جنگی شروع ہوتی ہے تو جہاں آرا کی محبت اور عشق میں راجپوت سردار دارا کی حمایت میں اور نگ زیب کے خلاف لڑتا ہے راجپوت جہاں آرا کے ایک دوسرے عاشق کے ہاتھوں مارا جاتا ہے مگر اس کا ایک ہار جہاں آرا کے ہاتھ لگ گیا جس کو وہ قیمتی یادگار سمجھ کر اپنے پاس رکھتی ہے"۔

اس کتاب میں اسی طرح کی اور بھی خرافات ہیں ... جو محض اورنگ زیب اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی گزشتہ تاریخ کو بدنام کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں برنیر، منوچی، اسمتھ وغیرہ جیسے متعصب اور یورپین مورخین نے جہاں آرا کی ذات کے ساتھ بہت ہی نازیبا حکایتیں منسوب کر دی تھیں لیکن سنجیدہ مورخوں نے حقائق کی روشنی میں ان کی تردید کر دی ہے۔ (بزم تیموریہ)

جہاں آرا کے سوانح نگار نے اس کی تالیفات میں ایک سیاحت نامہ اور ایک مثنوی بھی بتائی ہے مگر ان کا ذکر کسی مستند تاریخ یا تذکرہ میں نہیں ملتا۔ جہاں آرا بیگم کے حمدیہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

"آنجا کہ کمال کبریائے تو بود
عالم نمی از بحرِ عطائے تو بود
مارا چہ حد حمد ثنائے تو بود
ہم حمد و ثنائے تو سزائے تو بود"

منشی سنیل چند تاریخ آگرہ کے مصنف نے چند مرثیہ کے اشعار جو جہاں آرا نے اپنے باپ کی وفات کے موقع پر کہے تھے ملاحظہ ہوں ؎

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر
آیا شبِ فراق ترا ہم بود سحر
اے بادشاہِ عالم و قبلۂ جہاں
بکشائے چشمِ رحمت و بر حالِ من نگر
نالم چنیں زغصہ و بام بود بدست
سوزم چوں شمع در غم و دورم رود زمر

کلمات الشعراء، ریاض الشعراء اور خزانۂ عامرہ میں جہاں آرا بیگم کے ذوقِ شاعری کا پتہ چلتا ہے، ایک دفعہ جہاں آرا باغ کی سیر کو نکلی وہاں برقع میں صدی طہرانی چھپ کے یہ تماشا دیکھنے لگا جب بیگم کا ہاتھی اس کے پاس سے گزرا تو اس نے بے ساختہ مندرجہ ذیل مطلع پڑھا ؎

؎ برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بدماغش

جہاں آرا نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں۔ جب شاعر کو جہاں آرا کے سامنے آیا تو بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے بطور انعام دیے مگر ساتھ ہی حکم دیا کہ

اس کو شہر سے نکال دیا جائے کیوں کہ جہاں آرا کو شعر تو پسند آیا لیکن اس کی گستاخی پسند نہیں آئی۔

مولانا شبلی مرحوم ـــ اپنے مقالے (زیب النساء) میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیگمات کے لیے کس قسم کے ادب مقرر تھے"۔

جہاں آرا کی علمی فیاضی کی ایک اور مثال مرزا حسن بیگ رفیعؔ کی مثنوی کی ہے جو اس نے شاہجہاں آباد کے باغِ حیات بخش کی تعریف میں لکھی تھی اور اس کو حکمات الشعراء میں درج کیا ہے مثنوی کے اشعار جہاں آرا کو بے حد پسند آئے اس کے صلہ میں بیگم نے شاعر کو پانچ سو روپے بطور انعام بھجوائے۔

مولانا غلام علی آزاد تحریر کرتے ہیں کہ:

"مرزا محمد علی ماہرؔ نے جہاں آرا کی مدح میں ایک مثنوی لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا، بیگم نے ماہرؔ کو پانچ سو روپے بطور انعام دیے"۔

مثنوی کے مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو ؎

بذات تو صفات کردگار است
کہ خود پنہاں و فیضش آشکار است

مگر مولانا غلام علی آزاد اس روایت کو صفحہ نمبر ۱۱۴ نقل کرتے ہیں کہ "یہ شعر نعمت خاں عالیؔ کی مثنوی میں بھی ملتا ہے جو اس نے زیب النساء کی خرگاہ پر لکھی تھی"۔ "تذکرۂ مخزن الغرائب میں یہ تحریر ہے کہ مرزا محمد علی ماہرؔ نے نو سو اشعار کی ایک مثنوی زیب النساء کی شان میں لکھی جس میں مذکورہ بالا شعر زیب النساء کو بہت پسند آیا[1]

قدسیؔ کو ایک قصیدہ پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیا۔ قصیدہ کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

---

[1] بحوالہ بزم تیموریہ حصہ سوم،

تا سرزدہ از شمع چنیں بے ادبی
پروانہ زعشق شمع را سوختہ است

جس وقت یہ قدسی نقاب شہزادی عالم وجود میں آئی اُس وقت خرم چتوڑ کے رانا سے برسرِ پیکار تھا۔ خرّم کی فتح ہوئی تو منصب میں اضافہ ہوا، قدیم رسم کے مطابق دادا جہانگیر نے بچی کا نام جہاں آرا رکھا، جہاں آرا سے پہلی لڑکی حورالنساء کا انتقال ہو چکا تھا۔ جہاں آرا کی پرورش حوری جان کے سپرد کی گئی، حوری جان کی وفات کے بعد ستی النساء خانم نے جہاں آرا بیگم کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری لی۔

جہاں آرا بیگم کی پیدائش کے وقت تیموری حرم دنیا کی قابل ترین خواتین سے بھرا پڑا تھا حرم کے ماحول کے اثر سے جہاں آرا نے زندگی کے ہر شعبہ میں مہارت حاصل کر لی۔

جب شاہجہاں ۱۴ر فروری ۱۶۲۸ء کو سربراہِ ہند ہوا تو جہاں آرا کی عمر ۱۵ سال کی تھی ممتاز محل کی وفات کے بعد ممتاز محل کی نصف جائداد جہاں آرا کو عطا کی گئی اور محل کے تمام امور اور مہرداری وغیرہ سب ذمہ داری جہاں آرا کے سپرد کی گئی۔

مولانا محمد علم الدین سالک اپنی معروف تصنیف دُختران ہند میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"اب جہاں آرا کا اقتدار اور جاہ وجلال تمام منزلیں طے کر کے معراجِ کمال تک پہنچ گیا اب اس کا ہر شعبہ میں رسوخ ہر صیغے میں اثر امراء، ذی وقار اور شاہزادگان والا تبار اس کے آستانۂ دولت پر سر نیاز خم کرنا باعثِ فخر ومباہات سمجھتے تھے"[1]

قیام لاہور ۱۶۴۴ء میں ایک دفعہ جہاں آرا کے کپڑوں میں آگ لگنے سے جل گئی سلطنت کے معروف حکیموں اور جراحوں نے علاج کیا بادشاہ کو بیگم کے جل جانے کا بہت افسوس ہوا تمام بہنیں بھائی بیگم کی تیمارداری کے لیے فکر مند تھے عارف جراح کے علاج سے جب بیگم

---

[1] دُختران ہند صفحہ ۱۴۲

ٹھیک ہوگئی تو باپ کے ساتھ اجمیر جاتے ہوئے زخم پھٹ گئے۔ اب حصار کے فقیر باموں نے بیگم صاحبہ کا مکمل علاج کیا مگر دورِ حاضر کے مورخین کی رائے ہے کہ بیگم کا علاج کیبریل باٹن نے کیا تھا۔ اسی خوشی میں شاہجہاں نے اسے تجارت کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ کیبریل باٹن ۱۶۴۵ء میں نامزد ہوا جبکہ بیگم کے جلنے کا واقع ایک سال بعد کا ہے دوسرے یہ کہ اگر کیبریل باٹن بیگم کا علاج کرتا تو ضرور ہندوستان میں اس کی کوئی یادگار ہوتی۔ یہ جدید مورخین کی رائے بالکل غلط ہے اور فقیر باموں نے آخر میں بیگم کا علاج کیا اور فقیر کو بادشاہ نے انعام واکرام سے مالامال کر دیا۔

۱۰۵۶ھ میں جب نظر محمد والئ بلخ کی بہو بیٹیوں اور دیگر رشتہ دار بیگمات کو قیدی بنا کر دارالخلافہ لائے تو ان بیگمات کی نگہداشت اور مہمان نوازی کے فرائض جہاں آرا ہی نے ادا کیے[1]۔ دور دراز کے امراء بادشاہ کی آستان بوسی کے بعد جہاں آرا کی درگاہ پر حاضری دینے آتے تھے۔

منتخب اللباب کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ ۱۰۶۰ھ میں جب محمد صفی بن اسلام خاں دربارِ معلیٰ میں حاضر ہوا تو اس نے ۵ لاکھ روپیہ اور جنس جہاں آرا کی خدمت بطور نذرانہ پیش کیا[2]۔ خانہ جنگی میں بیگم دارا کی حامی تھی اور نظر بندی کے وقت چہیتی بیٹی، جہاں آرا نے اپنے باپ کی خاطر و خدمت اور ہمدردی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

یہ بات بھی صحیح ہے کہ دوراندیش عقلمند دانشور رحم دل جہاں آرا نے عالمگیر اور شاہجہاں اور دیگر بھائیوں سے صلح کرانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی یہ بات بالکل غلط ہے کہ جہاں آرا اور عالمگیر کی بول چال تک ختم ہوگئی تھی غور مابیٹ۔ جب عالمگیر نے ایک لمبی خوفناک بیماری کے بعد غسل صحت کیا تو جہاں آرا بیگم نے عالمگیر کا جشن صحت منایا اور اس وقت عالمگیر

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۵۸۰

[2] منتخب اللباب صفحہ ۷۰۵

جہاں آرا کو گراں بہا قوم بطور انعام عطا کرتا ہے[1] عالمگیر اور شاہجہاں کے درمیان صلح کرا کے بیگم نے جو قیمتی جواہرات بھی عالمگیر کو دلائے۔

"ایک طرف جہاں آرا بیگم بوڑھے باپ کا سہارا تھی تو دوسری طرف اپنے جواں بخت بھائی کی ترجمان تھی۔۔۔ اگر جہاں آرا کا دم نہ ہوتا تو باپ اور بیٹے میں نہ تو کبھی صلح ہوتی اور نہ ہی ہندوستان کا تخت و تاج سیاسی سازشوں کی مرصرانگیزیوں سے محفوظ رہتا۔"[1]

۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ کو جب شاہجہاں داعی اجل کو لبیک کہتا ہوا آشیانۂ خلد میں نشیمن نشیں ہو گیا تو یہ دنیا جہاں آرا کے لیے تاریک ہو گئی۔ اس وقت عالمگیر اور بیگم صاحبہ میں خط و کتابت ہوئی اس کا حرف حرف تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے، اس نے آخر تک خانوادۂ تیموریہ کی کشیدگیوں کا قلع قمع کرنے اور بھائیوں کی نا اتفاقی ختم کرنے کی کوشش کی اسی لیے بیگم نے عالمگیر کے بیٹے اعظم کی شادی داراشکوہ کی دختر زیب بانو سے کرائی زیب بانو کو جہاں آرا نے ہی پالا تھا شادی بھی زیب بانوں کی بیگم نے ہی کی تھی، عالمگیر خود بارات لے کر جہاں آرا کے محل پر آیا تھا۔[2]

شاہجہاں کی وفات کے ۱۶ سال بعد بیگم کا انتقال ہوا۔ عالمگیر اس وقت اجمیر تھا۔ تین دن تک بیگم کی موت کا غم منایا گیا۔ بیگم نے اپنا مزار حیات ہی میں نیا کرا لیا تھا، اور اس کے لیے کتبہ بھی خود ہی تجویز کیا تھا جو اس کے لوح مزار کا کام دیتا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اس مزار کا کٹہرا تو سنگِ مرمر کا ہے لیکن تعویذ بالکل خام ہے جو ہمیشہ سبزہ سے ڈھکا رہتا ہے۔

جہاں آرا اپنی خواہش کے مطابق خواجہ نظام الدین اولیا، کے مزارِ انوار پر ٹھیک بائیں میں دفن ہوئیں اس کی نیکی، انکساری، پرہیزگاری اور ذوق شاعری اس کے حسب ذیل شعر سے بھی ظاہر ہے جو اس کی تحریر مکتوب ہے:

---

[1] دختران ہند۔
[2] مآثر عالمگیری صفحہ ۲۰۸۔

تعبیر سبزہ نہ پوشید کسے مزار
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیا بس است

"الفقرۃ الفانیہ جہاں آرا مرید خواجگان چست بنت۔ شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ ۱۰۹۲ھ"

جہاں آرا بیگم صحیح معنوں میں فقیرہ تھی وہ نہایت سخی کریم النفس اور باذل تھی وہ علوم و متداولہ میں ماہر اور فنونِ لطیفہ سے پوری طرح واقف تھی اس کی سب سے بڑی خوبی حسنِ اخلاق کردار کی پاکیزگی اور عادت کی سنجیدہ تھی ہزارہا بیکس و مفلس ولاچار معذور بیوہ لڑکیوں کی امداد کرتی تھی۔

مولانا محمد علم الدین سالک اپنی مشہور تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ :

"تیموریوں کا حرم جن بلند مرتبہ اور اولوالعزم ہستیوں پر ناز کرتا ہے ان میں جہاں آرا بیگم خاص امتیاز رکھتی ہے اس قدسی منش اور کریم النفس خاتون نے قرونِ وسطیٰ کی تحریکِ نسوانی میں وہ انقلاب پیدا کیے ہیں کہ اس کا نام آسمان شہرت پر مہر و مہ بن کر چمک رہا ہے، اس عفت سرشت بلند اقبال بیگم کی بدولت طرزِ معاشرت میں خاص خاص نزاکتیں اور لطافتیں پیدا ہوئیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کے نام کی غلغلہ انداز صداؤں سے ہندوستانی تمدن و معاشرت کے در و دیوار آج تک گونج رہے ہیں[1]"۔

جہاں آرا بیگم کی شان و شوکت کے بارے میں منوچی بیگم سواری نکلنے کا نقشہ پیش کرتا ہے :

"جس وقت بیگم صاحبہ کی سواری محل سے دربار کو چلتی ہے تو بڑی شان و شوکت سے اور بہت سے سوار پیادے اور خواجہ سرائے جلو لیے چلتے ہیں

---

۱ دخترانِ ہند صفحہ ۱۳۸

خواجہ سرائے جو اس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے ہیں جس کسی کو سامنے دیکھتے ہیں ڈھکیل کر ایک طرف کر دیتے ہیں اور کسی کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ چلتے ہوئے 'ہٹو بچو' کا نعرہ بلند کرتے جاتے ہیں تمام شہزادیاں اسی طرح کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جو شخص انھیں آتا دیکھتا ہے فوراً رستہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہو جاتا ہے۔ ان کی سواری بڑی آہستہ آہستہ چلتی ہے آگے آگے بہشتی سڑک پر پانی چھڑکتے جاتے ہیں تاکہ گرد نہ اُڑے شہزادیاں ایک پالکی میں سوار ہوتی ہیں جس کے اوپر ایک بڑا قیمتی کپڑا یا سنہری جالی ہوتی ہے جس میں اکثر اوقات قیمتی پتھر اور جواہرات لگے ہوتے ہیں۔ پالکی کے گرد خواجہ سرائے مور کے پَروں کے پنکھوں سے مکھیاں اُڑاتے جاتے ہیں ان پنکھوں کے دستے جواہرات سے مرصّع ہوتے ہیں اور اوپر سنہرا کام ہوتا ہے نوکر سنہری یا روپہلی ڈنڈے ہاتھوں میں لیے ہوئے "ہٹو، بچو" پکارتے ہیں پالکی کے ساتھ ساتھ انواع و اقسام کی خوشبویات بھی ہوتی ہیں"۔ [۱]

شاہجہاں ۱۱ر اپریل ۱۶۵۸ء کو اطبا، کے مشورے سے بلوچپور پہنچے اس وقت بادشاہ کی علالت نے صحت کمزور کر دی تھی دھرمات کی شکست کی خبر بھی بادشاہ کو مل چکی تھی۔ دارا شکوہ نے باپ سے آگرہ واپس آنے کا اصرار کیا تاکہ باغی شہزادوں کے مقابلے کے لیے ایک نئی طاقتور فوج تیار کی جائے، اسی درمیان کچھ اور کمزور کوششیں مصالحت کے لیے کی گئیں جہاں آرا نے یقین دلانے کے لیے اورنگ زیب کو خط لکھا کہ "دراصل سلطنت کے سارے معاملات شہنشاہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں نیز یہ کہ وہ بجز نماز کے اوقات سارا وقت رعایا کے فلاح و بہبود کی دیکھ بھال اور مذہب کی اشاعت میں صرف کرتے ہیں۔ اس نے اس کی غیر محتاط

---

[۱] اردو ترجمہ صفحہ ۶۰۹ بحوالہ مؤخترانِ ہند صفحہ ۱۶۰ – ۱۵۹

بے باکی سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ ہر اصول عقلی اور دور اندیشی کے خلاف ہے کہ عمر میں سب سے بڑے شہزادے سے جنگ کی جائے تم کو راہ وفا دار و فرمانبرداری پر قدم رکھنا چاہیے بہتر ہے کہ اسی مقام پر رک جاؤ جہاں پہنچ گئے ہو، دونوں طرف مسلمانوں کی جان بچانے کے خیال سے اپنی عرضداشت حضور شاہ پیش کرو۔[1]

صالح نے بیان کیا ہے کہ جہاں آرا نے یہ خط اپنے بخشی محمد فاروق کے ہاتھ اورنگ زیب کے پاس بھیجا۔ مگر جہاں آرا کا یہ مشورہ قابل سماعت نہ ہوا، شہنشاہ نے بھی اسی مفہوم کا اورنگ زیب کو خط لکھا جس میں راہ سے الگ ہونے کی تاکید کی جو اورنگ زیب نے اختیار کر لی تھی، لیکن اورنگ زیب نے ساری غلطیاں داراشکوہ کی بتائیں ایک بار پھر دوبارہ باپ بیٹے میں خط وکتابت ہوئی مگر بے سود۔

ایک بار جہاں آرا خود اورنگ زیب کے پاس باپ کا پیغام لے کر پہنچیں جہاں آرا نے بتایا کہ "شہنشاہ تم کو اپنا ولی عہد نامزد کرنا چاہتے ہیں اور دارا کو پنجاب و مغربی سرحدی علاقہ میں مخصوص کرنا چاہتے ہیں۔ دکن معظم کو اور گجرات مراد کو اور بنگال شجاع کو دینے کا خیال ہے۔ لیکن اورنگ زیب نے جواب دیا کہ جب تک وہ پوری طرح دارا سے نہ نپٹ لے گا وہ شہنشاہ کے دیدار کے لیے نہ جائے گا۔ جہاں آرا مایوس ہو کر چلی آئی"[2]

جہاں آرا کا سلسلۂ نسب ننہیال کی طرف سے مرزا غیاث بیگ تہرانی الملقب بہ اعتماد الدولہ سے ملتا ہے ـــ مرزا غیاث الدین قزوینی کی بیوی کا نام دیوانجی بیگم جس کا سلسلۂ نسب شیخ سہروردی سے ملتا ہے جو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تک پہنچتا ہے جہاں آرا اس عفت نصب خاتون کی بیٹی تھی جس کے صدقے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کو تاج جیسی دولت ملی جو بجا طور پر عجوبہ عمارت سمجھی جاتی ہے۔[3]

---

[1] جامع الانشا، ص ۱۵۷ - ۱۵۸   [2] ظفر نامہ ص ۳۶ فتوحات عالمگیری ص ۲۷
[3] شاہجہاں نامہ جلد اوّل ص ۲۵۲

باغات

۱۔ باغ آگرہ :

شہنشاہ شاہجہاں نے ۸۰ بیگہ زمین پر اپنی بیٹی جہاں آرا کے لیے یہ باغ لگوایا جو بہت ہی خوبصورت ہے اس باغ میں خوشنما ولایتی پھل اور پھولوں کے درخت لگائے گئے اور باغ میں بہت سی حسین عمارات تعمیرات کرائی گئیں یہ عمارتیں بڑی دلکش تھیں اس باغ کو "انقلابِ زمانہ فوٹو" کہا جاتا تھا۔ آج اس باغ کی خستہ حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اس کی سیر عبرت کا سبق دیتی ہے۔ کسی زمانہ میں اس باغ کی روشیں پری پیکر بیگمات کی رفعتِ خرام ناز تھیں آج وہاں جانور گھومتے ہیں اور خار و خاشاک کے سوا کچھ نہیں افسوس جس باغ میں بادشاہ بیگم اور شاہی خاندان کی ماحوش خواتین جلوہ گر ہوتی تھیں ان عمارات پر اب زاغ و زغن کے آشیانے ہیں۔

۲۔ باغ صفاپور :

یہ باغ دولت سرائے سے سات کوس پر واقع ہے۔ یہ باغ بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا۔ اس باغ میں خوبصورت تالاب، کشتیاں اور چراغاں کا معقول انتظام ہوتا تھا۔

۳۔ باغ صاحب آباد :

اس باغ کی بنیاد جہانگیر نے رکھی، عالمگیر نے بھی اس باغ کی سیر کی۔ اس باغ میں بہت سی خوبصورت عمارتیں اور ایک حسین چشمہ تعمیر کرایا گیا۔ ان باغات کے علاوہ جہاں آرا بیگم نے بہت سے باغات لگوائے جن سے اس کی باغبانی سے دلچسپی اور سیر و تفریح کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴۔ باغ نور افشاں :۔

یہ باغ شاہجہاں نے بڑی دلچسپی سے کشمیر میں تعمیر کرایا جو دریائے جہلم کے کنارے پر واقع ہے، یہ باغ بھی بادشاہ نے جہاں آرا کے نام کر دیا تھا۔ یہ باغ اپنی خوبصورتی میں مثال رکھتا تھا۔

۵۔ باغ ڈل :

اس باغ کو خواجہ سرا جواہر خاں نے ڈل جھیل پر واقع تعمیر کرایا تھا جسے بعد میں بادشاہ نے اس باغ کو بھی جہاں آرا کے نام کر دیا۔ عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں تحریر کرتے ہیں کہ :

"یہ تینوں باغ " باغ صفاپور " " باغ نور افشاں اور باغ ڈل " جہاں آرا بیگم کی توجہ سے رشکِ جنت بنے ہوئے تھے، ان کی دل نشیں عمارات اور فردوس منظر روشیں ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے ہوئے تھیں"۔

جہاں آرا بیگم کی تعمیرات اور باغات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے باپ شاہجہاں ہی کی طرح بیگم کو فنِ تعمیر اور باغبانی کا ذوق شوق اور شعور تھا۔ اس کی دلچسپی اس کے ذوقِ نظر کا آئینہ دار ہے۔

وفات کے وقت بیگم نے تین کروڑ روپیہ چھوڑے اور وصیت کی کہ یہ رقم حضرت نظام الدین اولیا کے درگاہ کے خدّام کو عطا کی جائے۔ مگر عالمگیر نے اس رقم کا بہت سا حصہ دیگر رفاہِ عام کے کاموں پر صرف کیا[۱]

حقیقت میں تیموری حرم میں کس قدر قدسی نفس ہمدردِ بنی نوع انساں اور علم دوست ہستیاں موجود تھیں جن کے فیض سے ایک طرف تو علوم و فنون کو ترقی دی دوسری طرف دنیائے نسواں میں بیداری کی روح پھونک دی اور ثابت کر دیا کہ اپنے طرزِ عمل سے عورت کی زندگی کے ہر شعبہ میں فرشتہ رحمت اور ہادیٔ کامل ثابت ہو سکتی ہے قدرت نے اسے انسانی زندگی کو

---

[۱] بحوالہ دخترانِ ہند صہ ۱۸۲

مفید بنانے کے لیے پیدا کیا ہے وہ بلند سے بلند تر ین مرتبہ پر پہنچ کر غریب انسان کو فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ دنیاوی مال و دولت اس کے مقاصد میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ جاہ وجلال اسے فرائضِ منصبی کی بجا وری سے روک سکتا ہے[1]۔

ملک کی خواتین جہاں آرا بیگم کی خوبیوں سے سبق حاصل کر سکتی ہیں

بیگم ـــ علم قرأت، حدیث، فقہ، موسیقی علم طب اور دیگر علوم پر ملکہ رکھتی تھی بیگم صاحبہ کو نظم ونثر ـــــــ اور تاریخ پر بھی عبور حاصل تھا، بیگم کی زبان میں روایتی عبارت کی رنگینی چھوٹے چھوٹے فقروں کی کشش قاری کو مخمور کرتی ہے اس کے خطوط اس کی انشا پردازی اور شاہی خاندان کا امراء اور ہندو مسلم تعلقات کا پتہ چلتا ہے اور ان کو شاہی خاندان کس نظر سے دیکھتا تھا۔

مضمون کے آخر میں اورنگ زیب اور جہاں آرا بیگم کے خطوط اور جہاں آرا نے راجہ بدھ پرکاش کو جو خطوط لکھے ہیں ان کو تحریر کیا گیا ہے۔ راجہ بدھ پرکاش کے خطوط سے تیموریہ خاندان کی مذہبی رواداری اور ہندو مسلم شگفتہ تعلقات کا علم ہوتا ہے جو اس دور کے لیے بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔

کچھ جاہل اور حاسد مغربی سیاحوں نے جو ہند کے تمدن سے ناواقف تھے بے بنیاد من گھڑت افسانے جو افواہوں پر منحصر ہیں، بلیغ ترین عبارت میں مسلمان شہزادوں اور شہزادیوں کے اخلاق و کردار و عادات کو داغدار کرنے کے لیے اپنی کتابوں میں تحریر کر دیے ہیں وہ ضمیر کش سیاح جو یہاں کے دربار اور حرم کے وقار کو دیکھ کر حسد اور بغض رکھتے تھے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ جس طرح مغربی دنیا کے شاہی خاندان میں جو باتیں پائی جاتی ہیں وہی باتیں یہاں بھی موجود ہیں اسی قیاس آرائی اور خیال سے ایسی ہی باتیں تحریر کرتے چلے گئے جو سراسر غلط ہیں۔

---

[1] از مولانا محمد علم الدین، اسلامیہ کالج، لاہور

ڈاکٹر برنیر چند ٹکوں کی خاطر شہنشاہوں کو بقائے دوام کا تاج عطا کرتا ہے ایسے ہی سیّاح جو ہماری قوم و ملت کے دشمن تھے وہ صحیح بات کیوں کر لکھ سکتے تھے۔ ان سیاحوں نے واقعات کو غلط بیان ہی نہیں کیا بلکہ سمجھا بھی غلط۔ سب سے بڑا افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک کے غلام مورّخ جو انھیں کے شاگرد تھے انہیں کے نظریات اور خیالات کو دہراتے رہے چند ایماندار مغرب کے سیّاحوں مسٹر کارٹو جیسوں نے ان کے بیانات کی تردید بھی کی ہے۔ مسٹر کارٹو کا بیان ہے کہ:

> "جہاں آرا اگر ایک طرف نہایت حسین اور صاحب جمال تھی تو دوسری طرف حد درجہ کی روشن دماغ بھی تھی وہ لگاؤ جو اس کو اپنے باپ سے وہ پیار جو شہنشاہ کو اپنی چہیتی بیٹی سے تھا اس قسم کا ہے کہ عام آدمی کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔"

جہاں آرا کے بارے میں سب حاسد اہلِ دربار اور ناسمجھ سیّاحوں کے بیانات بے بنیاد ہیں، جو صرف پروپیگنڈہ کی حیثیت کے سوا کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ غور فرمائیں۔ ان سیّاحوں کی شہزادیوں تک کس طرح پہنچنے کی رسائی ہوئی ہوگی جبکہ وہ بادشاہوں کے دربار اور شہزادوں تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے صرف ان کا تعلق رہا بھی تو امرا تک دوسرے یہ کہ اگر اس طرح کی کچھ باتیں ہوئیں تو اس زمانے کے مورّخ اپنی تصانیف اور تذکروں میں ضرور ذکر کرتے۔

ثبوت کے طور پر مغرب پرست دوست لعل خاں کمبل پوش کا سفرنامہ انگلستان دیکھ سکتے ہیں جس کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ انسانی فطرت ہر جگہ اور ہر مقام پر یکساں ہے اور لعل خاں اسی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوا کہ وہ ان لوگوں کی نظر میں ایک انوکھی شخصیت تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ مغرب کے ان بے درد واقعہ نگاروں نے اپنا اثر و رسوخ جتانے کی خاطر یہ واقعات اپنے من سے گھڑ کر تحریر کر دیے ہیں۔

اورنگ زیب اور جہاں آرا کے خطوط جہاں آرا کے نام

یہ مشتاق مخلص اخلاص کے فرائض بجا لاکر عرض کرتا ہے آپ کا عنایت نامہ جو اعلی حضرت کے پاك حکم کے مطابق میری عرضداشت کے جواب میں جو میں نے غزنین سے، بادشاہوں کو پناہ دینیوالی درگاہ میں بھیجی تھی، لکھا گیا تھا، جمعرات کے دن راستے میں ملا اور نہایت ہی شادماں کیا اور میں نے اس عنایت نامہ کے مہربانی سے بھرے ہوئے مضمون پر اطلاع پائی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ خیر خواہ اعلی حضرت کے شرف رکھنے والے حکم کی بجا آوری اور فرماں برداری کا عاشق ہے اور اس حقیقت کو اپنی زندگی کا حاصل جان کر خزانوں کی آرزو نہیں رکھتا ہے اورساتھ ہی ساتھ درویش ہونیکا بھی کبھی دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ مرید .... بہت ہی عزت کرنے والا ہے اور طاعت کے لازمی فرض سمجھتا ہے۔

(انتخاباتِ رقعات عالمگیر)

جہاں آرا کا خط اورنگ زیب کے نام

"خدا کا شکر ہے کہ انصاف پسند شہنشاہ کی ذات مقدس تمام جسمانی عوارض سے مبّرا ہوگئی ہے اور ظلِ سبحانی ملک کے امن اور نظم و نسق پر پوری توجہ مبذول فرمارہے ہیں اور اپنی انصاف شعاری کی وجہ سے پسند نہیں فرماتے کہ کوئی ایسی حرکت عمل میں آئے جس سے ملک میں انتشار پھیلے یا خلقت کو تکلیف و ضرر پہنچے، بالخصوص اپنے فرزندوں کی طرف سے اپنی بیماری کے دوران میں ملک میں جو فتور پیدا ہو گیا تھا اعلی حضرت اسکے تدارک میں مشغول ہیں اور اس فتنہ و فساد کی آگ کو جو شہر وں کی تباہی اور خدا کی مخلوق کی خرابی کی جڑہے ،بجھانے میں مصروف ہیں۔ ظل سبحانی کو خاص طور پر عقلمند بھائی کی ناشائستہ اور نا زیبا حرکت سے سخت تکلیف پہنچی ہے اور اس لیے خیر خواہی کی بنا پر چند کلمات تحریر کئے جاتے ہیں تاکہ دلوں کی خس و خاشاك دور ہو جائے۔ اگر اُس والا گہربھائی کی غرض اس فساد کی آگ کو بھڑکانا اور جنگ و قتال ہے تو وہ خوب ہی انصاف فرمائیں کہ مرشد اور قبلہء حقیقی کے مقابلہ میں جنکی رضا جوئی خدا ئے عزوجل اور رسول (ﷺ) کی خوشنودی ہے جنگ و جدل کاہنگامہ برپا کرنا جسمیں

بیگناہوں کا خون بہایا جارہا ہے، اور آنحضرت پر تیر و تفنگ چلانا کس درجہ ناشائستہ حرکت ہے۔ اس کا پھل سوائے بدنامی اور بدی کے کچھ نہیں۔ اور اگر دشمنی اور قتل و غارت کا ہنگامہ شہزادہ 'بلند اقبال (دارا شکوہ) کے لئے ہے تو یہ بات بھی عقلمندی کے مذہب میں نہایت ناپسندیدہ ہے اس لئے کہ بڑا بھائی بھی شرعاًاور عرفاًباپ کے برابر ہے۔ بہر حال یہ جنگ اور خونریزی اور فتنہ انگیزی اُس عقلمند والا گہر بھائی کی جانب سے جو اپنے اطواراور اخلاق کی خوبیوں سے متصف ہے۔ اور انکی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہے اور جس نے ہمیشہ شہنشاہ کی رضا جوئی کو اپنا شعار رکھا ہے، کسی بنا پر پسندیدہ نہیں کہی جا سکتی۔ اس دار فانی کے چند روزہ قیام میں ایسے مذموم امور کا ارتکاب نہایت درجہ نامناسب ہے۔

مکن مکن کہ نکو گوہراں چنیں نکنند

مناسب یہ ہے کہ وہ نامدار بھائی ان افعال شنیعہ سے جو عاقبت میں رسوائی کا باعث ہیں، اجتناب کرے اور دین پرور اور معدلت گستر شہنشاہ کے مقدس دل کی رضا جوئی میں جہاں تک ممکن ہو سعی کرے اور آنحضرت کی خوشنودی کو دارین کی سعادت کا سبب سمجھ کر خاتم النبیین (ﷺ)کے ماننے والوں کی خونریزی سے رمضان کے

اس مبارک مہینہ مین محترز رہے اورمرشد، ولی نعمت اور والی سلطنت کے احکام کو جان و دل سے عمل میں لائے اسلئے کہ "کما اولی ا لامر منکم" کی آیت کے مطابق ان کے احکام کی پابندی شہنشاہ حقیقی کے احکام کی پابندی ہے اور خلیفہ الٰہی کے منشا کے خلاف چلنا خدائے برتر کے فرمان کی خلاف ورزی ہے۔ اگر دلی غرض اور مطلب اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو اس صورت میں بھی دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اس سر زمین میں جہاں قیام کا خیمہ نصب ہے، تو قف کیا جائے اور ہر مطلب کو جو دل میں ہو تحریری طور آنحضرت کے حضور میں پیش کیا جائے تاکہ خاطر عزیز کی خواہش کے مطابق اُسے عملی جامہ پہنایا جائے اور مقاصد برآری میں سلطنت و جہاں بانی کی آنکھ کی ٹھنڈک کے اغراض کی تکمیل میں سعی کی جائے۔"

اورنگ زیب کا خط شاہ جہاں کے نام

(اورنگ زیب نے کسی مصلحت سے بہن کے خط کا جواب تو نہ دیا مگر جہاں آرا کے بخشی محمد فاروق کے ہاتھ جو جہاں آرا کا خط لایا تھا، مندرجہ ذیل عرضی باپ کے نام بھیجی:۔۔۔۔۔۔)

"اس زمانہ میں سلطنت کے اہم کام اور ملکی و مالی امور حضرت کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اور سب اختیار شہزادہ' کلاں (دارا شکوہ) نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اس حد تک کہ معرض تحریر میں نہیں آسکتا۔جو اقتدار اسے حاصل ہو گیا ہے اسے وہ اپنے بھائیوں کے استحصال میں صرف کر رہا ہے۔ چنانچہ سلیمان شکوہ ایک زبردست فوج کے ساتھ شاہ شجاع کے مقابلہ پر جو آنحضرت کا صاحبزادہ ہے مقرر ہو چکا ہے اور اسطرح سے اس نے بتیس سالہ حکومت کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اسی طرح نفسانی خواہش سے مجبور ہو کر وہ اس نیا زمند کی تخریب میں بھی پورے طور پر ساعی ہے اور ایسے افعال اس سے سرزد ہو رہے ہیں جو شہروں اور عوام کو تباہی سے دوچار کر رہے ہیں اور اسنے آمدنی کے سارے دروازے اس خیر خواہ پر بند کر دئے ہیں۔(اس کے بعد دارا شکوہ کی مختلف شکایتیں کی گئی ہیں اور پھر لکھا ہے:۔) جب معاملات حد کو پہنچ

گئے اسوقت اپنی جان اور اپنے ناموس کی حفاظت کی خاطر تقاضائے دانشمندی سے مجبور ہو کر سدرہ جیسی اونچی درگاہ تک آپہنچا تاکہ حضور کی خدمت عالی میں تمام معملات پیش کئے جائیں ۔ جب یہ خیر خواہ مسافت طے کرتا ہوا دکن سے اجین کے نواح میں پہنچا، تو وہاں دیکھا کہ جسونت سنگھ شاہزادئہ کلاں کے اشارہ سے اس خیر خواہ کی ایذا رسانی پر مقرر ہے۔ اس نے آگے بڑھنے سے روك دیاا اور آداب و اخلاق کا لحاظ کئے بغیر نہایت دلیری سے اس بارے میں حکم نافز کر دیا۔ اس پر فدوی نے چند سمجھدار آدمیوں کو اس جاھل کے پاس بھیجا اوز اُسے اپنے ارادہ سے آگاہ کیا اور اس امر کی صراحت کی کۂ حضور پر نور قبلہ پناھی کی سعادت دیدار کے حصول کے سوا اس پیش قدمی کا اور کچھ مقصد نہیں ہے۔ مگر وہ ناعاقبت اندیش جو عقل و خَرد سے برابر آگے بڑھنے سے روکتا رہا۔ لہذا اس ظالم و جاہل کو اپنے راستہ سے دور کرنا ضروری ہو گیا اور وہ شکست فاش کھا کر حیران و پریشان پھر رہا ہے۔ اور اب شہزادہؑ کلاں ایک زبردست فوج کے ساتھ دھولپور تک تشریف لے آئے ہیں تاکہ چنبل کے پلوں کو اور دوسرے راستوں کو اس عریضہ گزار پر بند کر دیں۔ اس نے مختلف مقامات پر اپنے آدمی مقرر کردئے ہیں تاکہ اس خیر اندیش پر سارے راستے مسدود

ہو جائیں۔ چونکہ اس مرید کا ارادہ حضور پر نور کے دیدار کے سوائے اور کچھ نہیں تھا اسلئے یہ مرید دریائے چنبل کو بھداور کی راہ عبور کرکے خدمت اقدس میں ۔وانہ ہو گیا۔ اور ایسا سنا گیا ہے کہ وہ اس مخلص کے حضو ر کی خدمت میں خاک بوس ہونے کی سعادت کے صدمہ سے قتل و غارت کی آگ بھڑکانے پر تیار ہو گیا ہے ــــــ...... ے چاھئے کہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے خلل پیدا ہو ر اگر غرور اور تکبرّ کے جذبہ میں اور مددگاروں کی کثرت کے زعم میں وہ لڑائی کا بازار گرم ہی کرنا چاہتا ہے تو پھر اس صورت میں یہ عقید ت مند فدوی بھی دریغ نہ کریگا۔ بہتریہ ہی ہے کہ بزرگی کو کام میں لاتے ہوئے اور کر و فر کی بساط کوطے کرتے ہوئے وہ حضرت صوبہء پنجاب میں جو آنجناب کی جاگیر میں ہے، واپس چلے جائیں اور کچھ عرصہ تک اس خیر خواہ کو حضور کی معیت میں رہنے دیں بعد کو جو کچھ حضور کی رائے کے آئینہ میں ظہور میں آئے اس پر عمل کیا جائیگا۔“

اورنگ زیب کو اپنے والد ماجد کے انتقال سے دلی صدمہ پہنچا تھا۔ وہ خط و کتابت حسب ذیل ہے:۔

اورنگ زیب کا تعزیتی خط

"جہان کا پیدا کرنے والا جو بڑے مرتبہ والا ہے، اس عنایت فرما بہن کو اس حادثہء عظیم میں صبر جمیل عطا فرمائے اور اجر عظیم بخشے!اس قضیہء ناگزیر کی وجہ سے خاکسار کے غمگین دل پر جو کیفیت گزر رہی ہے اس کے بارے میں کیا لکھا جائے اور وہ حیطہء تحریر میں سما بھی کب سکتی ہے! قلم مین اتنی طاقت کہاں کہ اس جگر دوز واقعہ کی نسبت کچھ لکھے !اور زبان میں اتنی قوت کہاں کہ اس صبر ربا غم کے متعلق کچھ بیان کر سکے ۔ اُس صاحبہ کے غم اور اندوہ کے تصور سے اس بیتاب دل میں اکثررقت ا ور اضطراب طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن خدائی تقدیر اور آسمانی فیصلہ کے سامنے عاجزی اور تسلیم کے سوائے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔'جتنی مخلوقات روئے زمین پر ہے، وہ سب فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات باقی رہ جائیگی جو بڑی عظمت ا ور عزت والا ہے۔

بہر حال ا س خاکسار کو انشااللہ.............. سمجھیں۔

یقین ہے کہ سب تعزیت داروں ، بالخصوص اکبر آبادی

محل ☼ کو مناسب تسلی دیدی گئی ہوگی۔

میری مہربان! جو چیز اس وقت آنحضرات کے کام آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے ذریعہ اور مستحقین کو خیرات کے ذریعہ ثواب پہنچایا جائے۔ اس بارے میں کوشش فرمائیں اور اس کا ثواب آنحضرات کی روح پاک کو پہنچائیں ااور یہ گنہگار بھی اسی کا م میں مصروف ہے۔ امید کہ یہ مشورہ شرف قبولیت حاصل کریگا!"

جہاں آرا کا جواب

"خدائے بر ترو بزرگ بادشاہ عالمگیر کی برکت کا سایہ جہاں والوں پر ہمیشہ قائم و برقرار رکھے! اور قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ اس جانگداز مصیبت کا حال لکھ سکے اور اس روز سیاہ کی کیفیت کا ذرا سا بھی حال معرض تحریر میں لا سکے! اور زبان میں اتنی قدرت کہاں کہ جو کچھ گزر چکاہے اسے ذہن نشین کرائے ! جو کچھ مصیبت مجھ پر آرئی ہے اگر سمندر پر پڑتی تو وہ خشک ہو جاتا اور اگر دن پر آتی تو اس کی کیفیت شب دیجور کی سی ہوجاتی۔ ہر چند عقل جانتی ہے کہ اس قسم کے حادثات میں صبر و

☼ اکبر آبادی محل شاہ جہاں کی ایک بیوی تھی جسکا اصل نام عزیز النساء بیگم تھا۔ یہ آخر وقت تک شہنشاہ کے ساتھ رہی۔ اسکا انتقال عہد عالمگیری میں ۴ ذی الحج ۱۰۸۷ھ (۷ فروری ۱۶۷۷ء) کو ہوا۔ اورنگ زیب کو اسکا بے حد احترام منظور تھا۔

شکیبائی سے بڑھکر اور کوئی چیز کارگر نہیں ہوتی اور ہر چند اس کے سوائے کوئی علاج بھی نہیں ہے کہ انسان رضا و تسلیم سے متعلقہ آیات الٰہی اور ارشادات رسالت پناہی کے روبرو سر تسلیم خم کردے تاہم رنج حد برداشت سے کہیں زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ میں غمگین دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ اند وہ و ملال آفتاب کی ایک کرن (خط) مجھ پر پڑی .بلاشبہ وہ آب حیات تھا جو اس نیا زمند کی آتش سوزاں پر ڈاالا گیا ہے۔ مجبوراً بیچینی اور بیصبری سے در گزر کرتے ہوئے س عالی مرتبت سلطنت کے تابناک ستارے اور اس تاج و تخت کے عالی مرتبت وارث کی نصیحت کے مطابق دل حزیں کو تسلی دیتے ہوئے اس گرامی ہستی کی عمر و دولت کی ترقی کے لئے دعا میں مشغول ہوں امید ہے کہ اُس پسندیدہ سلطاان کی ملاقات کے پانی سے یہ جانگداز آگ بجھ جائیگی اور شام غم کی تاریکی صبح سعادت کی روشنی میں تبدیل ہو جائیگی۔ آنحضرات کے تعزییت داروں بالخصوص اکبر آبادی محل کے ساتھ مہر بانی آمیز سلوک کے بارے میں جو اشارہ ہوا ہے، وہ ظاہر اور بدیہی ہے اس لئے کہ جس قدر اشخاص باقی رہ گئے ہیں وہ سب کے سب انہی کی (یعنی بادشاہ کی) عنایت اور توجہ پر انحصار رکھتے ہیں۔ اس بارے میں اور کیا لکھا جائے جو ان پر ظاہر نہیں!"

خطوط بنام بده پرکاش

علیه العالیه
شاه جہاں
بنت
جہاں آرا

(۱)

زبدۃ الاماثل والاقران قابل مرحمت والا حسان راجه بده پرکاش بالتفات امیدوار بوده بداند عرضد اشتے که دریں ولا باچند جانور و ڈالی انار تفصیل مرقوم فرد جدا گانه بطریق پیشکش ارسال داشته بود، بوساطت بار یافتگان آستان قدس نشان رسیده از نظر مبارکه گزشت و آنچه معروض داشته بود که سفارش او ربخدمت حضرت خدیو زمیں و زماں ، خداوند مکین و مکاں ، ذریعهٔ آرامش عالمیان نموده آید، معلوم رای عالم آرا گردید. چوں حضرت سلاطین پناه بمبارکی در مبارکی درمستقر ا لخلافه اکبر آباد د ارند و ما بدولت درینجا ایم بدین وجه تحصیل مطلب او در توقف ماند. توجه مارا شامل حال خود داند.

بتاریخ شانزدہم جہادی الثانی سنه سیزده جلوسی

(۲)

زبدۃ الاماثل والاقران لایق المرحمه والا حسان مطیع الا سلام راجه بده پرکاش یه عنایات او التفات سر افراز بوده بداند عرضد اشتے که دریں ولا با ہلیله و انار ترش و نر بسی و مرغ زریں و نافه بآستان تقدس نشان ارسال داشته بود،

رسیده، بوساطت تتق نشینان عظمت و جلال به نظر فیض اثر گزشت۔ مرغ زریں دیگر بہمر سانیده ارسال داردواز راه عنایت ا ز پیشگاه فضل و کرم خلعت برای او عطا شده پرتو و صول اجگنده سعادت اندوز خواهد گردانید۔ التفات مارا شامل حال خود داند۔

بتاریخ یازدہم شہر شوال سنه چهارده قلمی شده

(۳)

زبدة الاماثل والاقران لایق رحمت واحسان مطیع الاسلام راجه بده پرکاش به عنایت و التفات امیدوار بوده بداند عرضداشتے که دریں ولا با نافہائے مشک و چنور بطریق پیشکش ارسال داشتہ بود، رسیده بوساطت تتق نشینان سرادق عظمت و جاہ بنظر کیمیا اثر گزشت۔ وجه پیشکش مذکور درجهء پذیرائی یافت و آنچه حقیقت سوندها وغیره تحویلداران خود و مال ضامن و حاضر ضامن شدن زمینداران پرگنه سادہوره و باز گریزایندن زمینداران مسطور آنہارا بامتاع نقدو جنس استدعا اینکه دریں کاده بروح الله خاں فوجدار میاں دو آب و د اور خاں فوجدار سہرند و علی اکبر امین فوجدار پرگنه سادہو ره نشان عالیشان شرف صدور یابد، معروض داشته بود،... . رای عالم آراگردید۔ معلوم باد که آں زبدة الاقران خطا کرد که باز آنها را باعتماد ضامنی زمیندار ان پرگنه مذکور نگاهداشت۔ چوں ما دریں

قسم معاملات بادشاہی دخل نمی وبکسی چیزی نمی نویسیم الحال او دریں باب عرضداشت بدرگاہ سلا طین پناہ ارسال دارد تا از حضور لامع النوربنام ہر کدام حکم صادر شود آنہا برطبق حکم والا زمینداران و تحصیلداران او رابستہ با متاع نزد او بفرستند تا آنکہ ایں حقیقت بہ عرض شرف اقدس اعلیٰ نرسد، روح ا للہ وغیرہ ہرگز بستہ نخواہند فرستاد.

بتاریخ بست و یکم ربیع الثانی سنہ ۱۸ جلوسی

(۴)

زبدۃالامثال والاقران بدہ پرکاش بہ عنایت امیدوار بودہ بداند عرضداشتہای متواتر کہ مع دو صندوق برف بجناب قدسیہ ارسال داشتہ بود، سید، از نظر علیہ گزشت. کیفیت مبرہن رای عالم آرای گردید. شما نوشتہ ایدکہ سید شفیع و بہوری از ذخیرہء سرکار برآوردہ ارسال داشتہ اندو نوشتہ آنہا بہ ما نرسیدہ.و برف ہم بسیار چرکین و یخ مطلقادرو نبود. ازیں بخاطر ما رسیدہ کہ شاید از یخدانہای ما نباشک د و زمیندار گڑھوال نوشتہ بود کہ من فرستادہ ام. واللہ اعلم . و دیگر آنکہ معروض داشتہ کہ بعرض مقدس معلیٰ رسانیدہ چناں شود کہ حق بحقدار برسد. ما را انچہ بایست کیفیت قبل ازیں بعرض خدمت رسانیدیم. چنانچہ حضرت مکربہ بخشیان حکم فرمودند کہ حسب ا لحکم

بنو یسید که ہر که تعدی و زیادتی خواہد کرد بجزای کردار خود خواہد رسید ۔ واوایں طور عرضداشدت نموده و پیش احدی بادشاہی ہم گفته که من بر کسی تعدی نه کرده ام۔ ایں حد از قدیم از آبا واجداد من بوده، اینہا به تعدی گرفته بودند۔ الحال که من قابو یافتم حدود خود گرفتم۔ اوایں طورمی گوید و شما ایں طور می گورئید تا وقتی که بادشاه امین نخواهند فرستاد، تحقیق نخواهند نمود و نفس الامر معلوم بندگان حضرت نخواہد که فوج تعین نمودن حکم خواہند فرمود۔ باز درایں اثنا که به سمت دکهن و کابل لشکر می باید عجیب است که طرف دیگر فوج روانه کنند صندوق سابق ہم رسیده بود۔ ہر سه صندوق سابق و حال رسیدند۔

تحریراً فی التاریخ ہفتم شہر جمادی الاولیٰ سنه ۲۱ قلمع شده

(۵)

زبدةالاماثل والاقران لایق العنایت والاحسان راجه بده پرکاش به عنایت و التفات امیدوار بوده بدانند۔ عرضه داشتے که مع نافهای مشک و ڈالی آنار دیں ولاارسال نموده بودید بوساطت باریابان حجاب سرادق عظمت و جلال رسیده ازنظر فیض اثر ما گزشت ۔ چوں از مشک اول بسیار محظوظیم ازیں جہت تاکید نموده می شود که مشک

تقیلدی نفرستید۔ در گرفتن مشک مزکوراحتیاط تمام نموده اصل آن را ارسال می نموده باشید۔ عنایت ما را شامل حال خود دانید۔

تحریراً فی التاریخ ۲۱ شهر رمضان سنه ۲۱ جلوس والا

(۲)

اللّٰه اکبر

زبدةالاماثل و ا لاقران لایق العنایت والاحسان راجه بده پرکاش بعنایت امیدوار بوده بدانند، عرضه داشتے که مع پیشکش بازو شهد مرسول نموده بودید، رسیده ارنظر فیض اثرما گزشت۔ باز چوز بود عوض کرده گرفتیم و شهد نیز پسند طبع افتاد۔ دیگر از مفسدی و متمردی زمیندار سرینگر که معروض نموده بودید، بده ہمیشه میاں شہاو اور عناد میگزردواز بدبختی خود باز نمی آید خوب کردید که ایں مقدمه رابه جناب مقدس معلی[۲] عرضداشت نمودید۔ و حقیقت باریدن برف و کوتاہی نمودن عبدالرحمن داروغه درگرد آوری برف و اجورہء مزدوران که عرض نموده بودید معلوم رای عالم آرای گردید۔ بمومی الیه نشان عالیشان بتا کید تمام فرستاده شک که گرد آوری برف بواقعی بکند واجورہء مزدوران موافق قرار داد می رسانیده باشد۔ واگر مثل سال گزشته کوتا ہی خواهد کرد، نتیجهء نیک نخواہی یافت۔

تحریراً فی التاریخ بست و پنجم ماه محرم سنه ۲۳

ہندوستانی اینٹی گنی

بحوالہ جہاں آرابیگم مصنف ضیاء الدین احمد برنی، مضمون سرجادوناتھ سرکار اینٹی گنی یوڈی پس کی لڑکی تھی، ساری عمر کو ارپن میں بسر کی، اوصاف حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ اس میں موجود تھے۔ اس کے والدکو تھیبز کی حکومت سے بر طرف کر دیا اینٹی گنی نے اپنے باپ کی اور بڑے بھائی کی بڑی خدمت گزاری کی جس کی سزامیں اس کے بھائی نے زندہ دفن کردیا۔ یہ لڑکی بھی جون آف آرک اور جہاں آرا کی طرح لا زوال شہرت رکھتی ہے۔

(۱)

طاقتور اشخاص کا زوال، اُن لوگوں کی مصائب جو ایک زمانہ میں دنیوی مرتبہ اور دولت کی انتہائی بلندی پر گامزن تھے، افکار وآلام جو صحت اور مسرت بخش زندگی شام کو دھندلا کردیتے ہیں۔ یہ سب اخلاقی سبق دینے والے پیغمبروں اور غم کی تصویر کھینچنے والے شاعروں کے ہردلعزیز موضوعات رہے ہیں۔ یہ رحم و خوف کا جذبہ پیدا کرکے ہماری روحوں کو آلایش سے پاک کر دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ بیک جنبش حسب و نسب اور شہرت، دولت مندی اور خوبصورتی کی تفریقوں کو بھی بھالیجاتے ہیں اور

ان اشخاص کو جو زمین پر سب سے بڑے کہلاتے ہیں، ادنیٰ درجہ کے اشخاص کی سطح پر لے آتے ہیں۔ اسوقت ہم محسوس کرتے ہیں کہ نبی آدم آنسوئوں کی وادی میں برابر کے بھائیوں کی حیثیت رکھتے ھیں۔

لیکن قسمت کی ناپائیداری ایسا گیت نہیں ہے جو تاریخ میں ہر ایسے المیہ کے آخری سین میں سنا جاتا ہو۔ استفادہء لذائذ زندگی کا انتہائی مقصد نہیں ہے اور نہ وہ انسانی قوت برداشت کی سب سے بڑی آزمایش ہے۔

زندگی کوئی بیکار دھات نہیں ہے،بلکہ وہ لوہاہے جیسے گہری تاریکیوں سے کھودا گیا ہو، اور جلا ڈالنے والے خوف سے گرم کیا گیا ہو، اورغم آلود اشکوں کے پانی میں ڈبو یا گیا ہو، ور تبا ہی کے صدموں سے پٹ پٹ کر اسنے شکل اختیار کی ہو اور قابل استعمال بنا ہو۔

بعض اوقات غم و آلام کے کانٹوں کا تاج فرض منصبی کی ادائگی، بہادرانہ صبر اور خود فراموش قربانی کے ذریعہ روحانی روشنی کے ھالہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اسوقت بدنصیبی کی تلخیوں کا شکار اُس بدترین ضرب پر فتح پالیتا ہے جو وہ پہنچا سکتی ہے اور پھر وہ پہلے کے مقابلہ میں شان وشوکت کے زیادہ بلند کنگورہ پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ زندگی میں واقع ہو سکتا ہے، یہ ایک ایسے نام کی

حیثیت بھی اختیار کرسکتا ہے جسکی یادہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمانہء آئندہ کی محبت کرنے والی نسلوں کے دلوں میں محفوظ رہے۔

(۲)

خود ہمارے ملک میں ایک ایسی مبارک ہستی جہاں آرا بنت شاہ جہاں کی ذات تھی۔ جیسا کہ ایک فرانسیسی شاعر نے کہاہے کہ جب (۱۶۱۴ء میں) "اپنی نسل کا یہ پھول پہلے پہل کلی کی شکل میں نمودار ہوا ، شہنشاہ اکبر کا آفتاب ابھی تک نیلگوں آسمان پر ضوفشانی کر رہا تھا۔" (یہ خیال اس اعتبار سے صحیح ہے کہ اسوقت تک ہندوستان کا آسمان عہد اکبر کی شفق سے تابناک ہو رہا تھا۔) اپنے والد کے عہد حکومت کی ابتدا میں اپنی والدہ کے انتقال (۱۶۳۱ء) کے بعد وہ ملک کی سب سے بڑی خا تون اور شاہان مغلیہ میں سب سے جلیل االقدر شہنشاہ کے تخت و تاج کی طاقت بن گئی اور ۲۷ برس تک اسی اعلیٰ منصب پر فائز رہی۔

چوبیس برس کی عمر تک اسکی زندگی سرتا پا مسرت اورشان و شوکت میں گذری اور کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا جو اسکی تابناک زندگی کو دہندلا کرنے والا ہو۔ ہندوستان کے دوسرے حصصے کے خود مختار بادشاہ،

سلطنت مغلیہ کے خراج گزار رافہ اور نواب، شاہی خاندان کے افراد اور سلطنت کے امرا۔ سب ہی اپنی اپنی تکلیف میں اس کی مہر بانی آمیز سفارش کے جویا رہتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی درخواست امداد رد ہو گئی ہو۔ وہ بے انتہا دہلت کی مالک تھی ۔ اسکی جلیل القدر ماں ممتاز محل جو ترکہ اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی، اس میں سے نصف رقم یعنی ۵۰ لاکھ روپیہ اسے دیا گیا تھا علاوہ اسکی وسیع سالانہ آمدنی کے اور سورت کے محاصل کے جو اپنے وقت میں ہندوستان کی مالدار ترین بندرگاہ تھی ۔ بادشاہوں اور شہزادوں، امیروں اور کم درجہ کے افسروں کے پاس سے جو تحفیے تحائف اسے ملتے تھے وہ اُن تحائف سے دوسرے نمبر پر ہوتے تھے جو خود شہنشاہ کو ملا کرتے تھے۔

اور اس کے باوجود وہ اپنی ساری دولت اور اثر غرور و تمکنت کو ترقی دینے یا

یا لذائذ دنیا سے متمتع ہونے میں صرف نہیں کرتی تھی، بلکہ دوسروں کی بھلائی اور بہبودی کے کاموں میں اسے خرچ کر ڈالتی تھی۔ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں وہ تیمار دار کے لقب سے مشہو ر تھی۔ مصیبت زدوں کی مصیبتوں کو ہلکا کرنے، شاہی خاندان کے تنازعات کا خوش اسلوبی سے فیصلہ کرانے، یتیموں کی پرورش کرنے

اور اپنی شرافت اور سلیم الطبع کے ذریعہ مجرمین پر سے شاہی عتاب کا رخ موڑنے میں وہ اپنی قوتیں صرف کرتی تھی۔

وہ غم سے آشنا ہو چکی تھی۔ اسکی پیاری ماں کا۔ مائیں عام طور پر سب سے بڑی بیٹی کی ساتھ بچہ کی بجائے بہن اور دوست کی طرح پیش آتی ہیں۔ اس کی ماں کا انتقال اس وقت ہوا تھا جبکہ اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ گیارہ سال بعد وہ اتفاقیہ طور پر بری طرح جل گئی اور چار مہینے تک تو وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ اس نے شادی نہین کی اور ماں بننے کی سعادت بھی جو عورت کی زندگی کی بلندٔ ترین خواہش کی تکمیل ہوا کرتی ہے۔ اسے نصیب نہیں ہوئی۔

دنیوی عظمت کی انتہائی بلندی پر پہنچنے کے باوجود اسکی روح خدا کی طرف رجوع رہتی تھی اور وہ حضرت میاں میر (لاہور)کے مریدوں کے سلسلہ میں منسلک ہو گئی تھی ۔ اس نے حضرت شیخ معین الدین چشتی کی جو حضرت میاں میر سے بہت پہلے ہو گزرے ہیں، زندگی اور تعلیمات کا مطالعہ کیا تھا اور "مونس الاا رواح" کے نام سے فارسی زبان میں ان کی زندگی پر ایک مختصر رسالہ بھی تحریر کیا تھا تا کہ دوسرے

لوگ جو روحانی روشنی کے متلاشی رہتے ہیں اس سے مستفید ہوں۔

(۳)

شاہی گھرانے کے اندر اسکی زندگی کا مقدس مشن صلح کرانے والے کا تھا۔ اسکے بھائی اپنے دکھ درد میں اس سے اپنے دل کی باتیں کہتے تھے۔ دارا جو اُن سب میں بلحاظ عمر اس سے قریب ترین تھا (اسلئے کہ وہ صرف ایک سال چھوٹا تھا) اس سے شدت سے محبت کرتا تھا اور وہ خود بھی اسکے خیال ، مقاصد، حتیٰ کہ صوفی کی حیثیت سے اسکے روحانی مشاغل کی ہمنوا تھی،اور اس نے دارا کی بیوی کے ساتھ بہن کا سا سلوک کیا تھا اور شاہی جوڑے کی درد ناک موت (۱۶۰۹ء) کے بعد ان کی یتیم بچیوں کی پرورش ایسی محبت سے کی تھی گویا کہ وہ خود اسکے اپنے بچے ہیں ، حتیٰ کہ خشک مزاف اور پیش بیں اورنگ زیب بھی جو دارا اور دارا کے رفقا سے پیدایشی نفرت رکھتا تھا، اسی سے رجوع ہوتا اوردکھ درد کی داستان بیان کرتا تھا جیسا کہ ذیل کے خط سے معلوم ہولے گا:۔

اورنگ زیب بنام جہاں آرا (۱۶۵۷ء)

"یہ امر آپ ہوایدا ہے کہ جب سے شہنشاہ نے منصب سے سرفراز فرمایا ہے میں نے حتی المقدور اور حتی

الوسع اُس فرض کی بجا آوری کی ہے جو مجھ پر ڈالا گیا تھا..... مجھے معلوم نہیں کہ اب مجھ سے ایسی کون سی خطا سر زد ہو گئی جس کی بنا پر انہوں نے مجھ جیسے وفادار خادم کے خلاف ایسی کارروائیاں کی ہیں جن کا میں مستحق نہیں ہوں اور جو دور و نزدیک کی نظروں میں میری بے عزتی اور رسوائی کا موجب بن رہی ہیں۔ اولاً قلعہء اسیر پہلے مجھے عطا کیا گیا تھا اور پھر بھائی مراد بخش کو اور بالآخر پھر مجھے عطا اکردیا گیا تھا، لیکن اب ایک حکم موصول ہوا ہے کہ مجھے وہاں اپنا قلعدار نہ بھیجنا چاہئے !...

"خدا جانے شہنشاہ کی طرف سے مجھ پر اسقدر بے اعتمادی اورناخوشی کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے الئے کہ جان و مال کی پروا کئے بغیر جو وفادارانہ اور نمایاںخ خدمات میں نے گزشتہ بیس سال میں آنحضرت کے لئے انجام دی ہیں ، سہ میرے بھتیجے (سلیمان شکوہ) کی خدمات کے برابر بھی نہیں سمجھی گئیں۔

"ثانیاً اب دا دا بھائی جیو (دارا شکوہ) نے۔اور آنحضرت کو بخوبی معلوم ہے کہ انہیںمجھ سے کتنی محبت ہے۔ اپنے کا رندہ ملا شوقی کو اس جگہ (دکھن میں) مامور کر دیا ہے تاکہ وہ والی بیجاپور کو خوش خبری سنائے

اور بتائے کہ (آنحضرات نے) اسکی عرضداشتوں کو شرف قبولیت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موخرالذکر اور اسکی طرح کے دوسرے لوگ پہلے سے زیادہ سر کش ہو جائینگے۔ پیاری بہن، اگرچہ میں نے اپنے آپ کو کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ میں شہنشاہ کے مریدوں اور ملازموں کے زمرہ میں داخل ہوں بلکہ ہمیشہ اپنے تئیں حضور کا غلام ہی سمجھاہے اور ہمیشہ اس سلوک پر قانع رہا ہوں جو شہنشاہ کی طرف سے مجھ سے برتا جا رہا ہے۔ تاہم چونکہ میں نے اپنی زندگی عزت اور احترام میں بسر کی ہے اور اس صوبہ پر بغیر کسی درخواست کے اور خود آنحضرت کے حکم سے اسکے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے حکومت کی ہے ا س لئے قدرتی طور پر اس کارروائی کا نتیجہ میری بے عزتی اور معزولی کی شکل میں نکلے گا۔ میں پریشانی کے بھنور میں پھنس گیا ہوں اورنہیں سمجھ سکتا کہ آنحضرت میرے متعلق کیاارادے رکھتے ہیں..... اگر حضور کی یہ خواہش ہے کہ ان کے تمام ملازمین میں اکیلا میں اپنی زندگی کے دن بے عزتی میں گزاروں اور بالآخر ناسزاوار طریقہ پر تباہ برباد کردیا جائوں (یعنی اپنے سب سے بڑے غاصب بھائی کے ہاتھوں قتل ہو جائوں) تو پھر میرے پاس اور کوئی چارئہ کا رنہیں ہے کہ میں سر تسلیم خم کردوں۔لیکن چونکہ میرے

لئے اس طرح کا جینا اور مرنا مشکل ہے.... اسلئے بہتر یہی ہے کہ میں آنحضرت کے حکم سے ایسی زندگی کی شرم سے چھٹکارا پائوں۔ میرا سر اور میری جان آنحضت کی خوشنودی کی خاطر ہر وقت قربان کیجا سکتی ہے۔ تاکہ بعض لوگوں کے دل میری طرف سے مطمئن ہو جائیں۔

"دس سال سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہے اور اسکے بارے میں مجھے پورا یقین ہوچکا ہے کہ وہ (یعنی دارا) میری جان لینے کے درپے ہیں اور اسی لئے میں نے اپنے عہدوں سے استعفا دیدیا تھا، لیکن بعدکو محض والد ماجد کی خوشنودی کی خاطر میں نے (دوبارہ) اس زندگی کو اختیار کرلیا....."☼

(۴)

جہاں آرا کے لئے انتہائی آزمایش کا زمانہ ۱۶۵۷ میں آیا۔ اسکا باپ شاہ جہاں سخت بیمار ہو گیا تھا اور اسوقت چاروں بھائی مسلح ہو کر تخت کے حصول کی جدوجہد میں لگ گئے حالانکہ شاہ جہاں کی آنکھ ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔اس دردناک سانحہ کی داستان میری تاریخ

☼ آداب عالمگیری میں جہاں آرا کے نام اورنگ زیب کے ۲۸ خطوط ہیں جن میں سے ۱۸ محض رسمی اور بیکار ہیں، اور دو بہت اہم اور طویل ہیں۔ ان دو خطوط میں سے ایک کے اقتباسات اوپر دیے گئے ہیں۔ اسے لفظاً اورنگ زیب کے استعفے سے دس سال بعد کا خط نہیں سمجھنا چاہیے یعنی ۱۶۵۴ء کا، بلکہ اسے ۱۶۵۷ء کا خط سمجھنا چاہیے۔

اورنگ زیب (جلد ۱ و ۲) میں تمام و کمال بیان کر دی گئی ہے اور ایسا کرتے وقت میں نے نہ صرف معاصرانہ دستاویزات پر اعتماد کیا ہے بلکہ اُس ڈرامے میں جو لوگ حصہ لے رہے تھے، میں نے حتی الامکان انہی کے الفاظ میں اسے پیش کردیا ہے۔ یہاں اتنا بیان کرنا کافی ہوگا کہ دارا شاہجہاں کا منظور نظر مہین پور خلافت تھا، لیکن اورنگ زیب چاروں بھائیوں میں سب سے قابل تھا اور مسلسل کامیابیوں کے ذریعہ وہ آگرہ تک پہنچ گیا تھا جہاں بوڑھا شہنشاہ اُسوقت اقامت گزین تھا۔دارا آگرہ سے دس میل دور سمو گڑھ کی شکست فاش کے بعد دہلی کی طرف بھاگ نکلا اور اورنگزیب نے اپنے باپ کو آگرہ کے قلعہ میں محصور کردیا اورتین دن کی ناکہ بندی کے بعد جس میں مطلق خون نہیں بہایا گیاپانی کی رسانی کو بند کرکے اس کو بلا کسی شرط کے حوالگی قلعہ پر مجبور کر دیا تھا۔

ایسی حالت میں جہاں آرا نے اپنے فتح مند بھائیوں سے (کیونکہ شہزادہ مراد بخش نے اورنگ زیب کے ساتھ اتحاد عمل کر رکھا تھا) ۱۰ جون ۱۶۵۸ء کو آگرہ شہر کے باہر نور منزل میں جہاں وہ خیمہ زن تھے ملاقات کی اور ان چاروں میں سلطنت کی پر امن تقسیم کے اصول پر

مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ لیکن اسکی کوشش ویسی ہی بیکار گئی جیسا کہ وہ خط جو سمو گڑھ کی لڑائی سے پہلے اس نے اورنگزیب کے نام تحریر کیا تھا۔

(۵)

شاہ جہاں کی حکومت سے دست برداری کے بعد جہاں آرا اپنی چھوٹی بہن روشن آرا کے طریقہء کار عمل کا تتبع کرسکتی تھی اور دربار اورنگزیب سے وابستہ ہو کر دولت، عیش و تنعم اورآزادی کی زندگی گزار سکتی تھی، لیکن اس نے اینٹی گنی اورڈ یلٹا کا طریق عمل اختیار کیا۔ ایک فرانسیسی شاعرلی کانٹے ڈیلائل (Leconte de Lisle) نے اپنے غمزدہ باپ کی خاطر اسکے ایثار و قربانی کی داستان کو انتہائی ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے جسکے کچھ اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

(میں نے ان طویل شاعرانہ اقتباسات کو غیر ضروری سمجھ کرخدف کردیا ہے۔ لیکن یہ امر مسرت بخش ہے کہ فرانسیسی شاعری میں بھی جہاں آرا کے گیت گائے جاتے ہیں۔)

(۶)

ساڑھے سات سال تک حالت قید میں رہنے کے بعد شاہ جہاں کا انتقال۱۶۶۶ء میں ہو گیا ۔ جہاں آرا نے آخر وقت تک اسکی تیمارداری کی اور جب سب کچھ ختم ہو

گیا تو اس نے سیدھے سادے طریقہ سے باپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ اپنے باپ کی وفات کی خبر سنتے ہی اورنگ زیب نے اپنی بہن کے نام تعزیت کا خط بھیجا اور جہاں آرا نے بھی اسکی تعزیت کے خط کا جواب دیا۔

یہ ۱۶۶۶ء کا واقعہ ہے۔ شاہ جہاں کی موت نے جہاں آرا کو اسکی اپنی پسند کردہ قید سے آزاد کردیا۔ وہ اب قلعہ سے باہر نکلی اور دہلی شہر میں علی مردان خاں کی سابقہ حویلی میں فروکش ہوئی ایسی حالت میں کہ اورنگزیب اسکی بہت عزت کرتا تھا اور ہر معاملہ میں اُس سے مشورہ لیتا تھا اور دارا کی یتیم بچیوں کی خبری گیری اور رکھ رکھائو کا کام بھی اسی سے متعلق تھا۔ اس طرح وہ کم و بیش اور ۱۵ سال تک زندہ رہی اور جب اس نے ۲ ستمبر ۱۶۸۱ء کو وفات پائی تو اسنے خواہش ظاہر کی کہ اسے اُسی بے چھت کے مقبرہ میں جس پر گھاس لہراتی رہتی ہے ، دفن کیا جائے۔ اس قبر کو اس نے شاہ جہاں آباد کی حدود کے باہر حضرت نظام الدین اولیا کے وہیں ہندوستانی اینٹی گنی کا جسد فانی مدفون ہے۔ قبر پر جو کتبہ ہے، وہ حسب ذیل ہے:۔

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

اورنگ زیب اور جہاں آرا بیگم کے خطوط انکے کردار، ذہانت حسنِ اخلاق سیاسی بصیرت انتظامی صلاحیتوں رعایا اور غربا پروری مصلحت بینی والدین کا احترام مذہبی جذبات بزرگانِ دین سے عقیدت بھائیوں کے نفاق کو دور کرنے کی کوشش سلطنت کو مستحکم بنانے کے ارادوں بڑے اور چھوٹوں کی خدمت اور خلوص کی سہی عکاسی کرتے ہیں ان خطوط سے اس زمانہ کی سیاسی سماجی مذہبی اور اقتصادی اور اخلاقی زندگی کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے ۔ بد ھ پرکاش کی خط و کتابت سے مغلیہ بادشاہوں کی مذہبی رواداری کا پتہ چلتا ہے ان خطوط سے بہت سی غلط فہمیاں جو (جہاں آرا بیگم اورنگ زیب اور شاہجہاں)کے بارے میں متعصب اور جاہل مورخین نے اپنے بیانات سے پیدا کردی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں ۔ حقیقت میں یہ خطوط جہاں آرا اورنگ زیب کے کردار وعمل کے آئنہ دار ہیں سر جادو ناتھ سرکار کا جہاں آرا کے بارے میں مضمون بیگم کی خصو صیات و صلاحیت اور قابلیت کا نقشہ پیش کرتا ہے اور اسکی زندگی کے تقدس اور پا کِ دامنی کی مثال پیش کرتا ہے اور دیگر ممالک کی اعلیٰ کی شہزادیوں سے جہاں آرا بیگم کو تاریخی آئنہ میں بلند مرتبہ کی مستحق قرار دیتے ہیں۔

روشن آرا بیگم

روشن آرا بیگم جہاں آرا بیگم کی چھوٹی ہمشیر تھی، وہ عالمگیر سے بڑی تھی۔ جہانگیر کے گیارہویں سن جلوس میں ممتاز کے بطن سے پیدا ہوئی۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ :

"اتوار کے روز یکم رمضان المبارک ۱۰۲۶ھ کو چار گھڑی اور سات پل گزرنے پر مجھے اطلاع ملی کہ شہزادہ خرم کے حرم سرا میں آصف خاں کی دختر نیک اختر کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے۔" (تزک جہانگیری)

روشن آرا کے پیدا ہونے کے دنوں جہانگیر برہانپور میں تھا۔ شہزادی کا نام روشن آرا رکھا گیا۔ اور نذر و نیاز مسکینوں اور غرباء میں تقسیم کی گئی۔ روشن آرا کی تعلیم و تربیت ستی النساء (ہمشیر ملک الشعراء طالب آملی) کے سپرد کی گئی۔ ستی النساء نے روشن آرا کو دینی و درسی کتب کے علاوہ علم طب اور دیگر علوم و فنون میں طاق کر دیا۔

روشن آرا بہت حسین و جمیل شہزادی تھی روشن آرا بھی جہاں آرا کی طرح بہت ذہین تھی وہ اورنگ زیب کی حامی اور اپنے بھائی دارا شکوہ سے حسد رکھتی تھی۔ روشن آرا محل کی سازشوں کو اورنگ زیب تک پہنچاتی رہتی تھی وہ حرم کی ہر سیاسی بات سے باخبر تھی۔ ممتاز محل بھی اورنگ زیب کو بچپن سے ذہین مانتی تھی اور شہزادہ اورنگ زیب کو بہت چاہتی تھی۔ نورجہاں بھی اورنگ زیب کی ہونہار اور ذہانت، سادگی اور مذہب کی پاسبانی سے بہت ہی متاثر تھی نورجہاں اورنگ زیب کی ہونہاری کی پیش گوئی کرتی ہوئی اس کی کامیابی کے لیے دعائیں بھی کرتی رہتی تھی۔

ایک بار اورنگ زیب کی سالگرہ کے موقع پر دو ہاتھوں "سدھاکر" اور "صورت سندر" کی کشتی کا تماشا کرایا گیا اس موقع پر شاہجہاں جھروکے میں بیٹھا ہوا تھا اور جہاں آرا اور

روشن آرا بیگم بھی شاہجہاں کے قریب کھڑی تھی اور نگ زیب، داراشکوہ اور شجاع بھی امراء کے ساتھ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تماشا دیکھ رہے تھے شہزادہ مراد اس وقت بہت کمسن تھا۔ آخر میں صورت سندر، نام کے ہاتھی جو بہت ہی خونخوار اور مست تھا اورنگ زیب کو مع اس کے گھوڑے کے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر زمین پر پٹک نے کا ارادہ کیا تو یہ خوفناک منظر دیکھ کر روشن آرا کی حالت بگڑنے لگی اور بھائی اورنگ زیب کی زندگی کی دُعا کرنے لگی، اورنگ زیب نے ہاتھی پر تلوار کا وار کیا۔ ہاتھی تلوار کے وار کے بعد بھاگ نکلا شاہجہاں اپنے جگر گوشہ کی شجاعت دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اورنگ زیب کی بہادری کے اس منظر سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، روشن آرا کو بھی بہت راحت ہوئی۔

روشن آرا میں وہ تمام محاسن اور خوبیاں موجود تھیں جو ایک مُسلم خاتون میں ہونی چاہئے اس کی رعایا نوازی، غرباء پروری سے ہر امیر اور وزیر خوش تھا اور اس کی قیادت سے متاثر تھا۔ مگر روشن آرا کا چراغ جہاں آرا کے سامنے نہیں جل سکا:

"تیموریوں کا حرم اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر دنیا میں مشہور تھا۔ حرم کی مستورات علمیت فضیلت اور سلیقہ مندی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا"

جب روشن آرا نے آنکھیں کھولیں تو اس وقت نورجہاں کی پالیسیوں سے دربار میں توڑ جوڑ کا ماحول سرگرم تھا اور اسی ماحول سے روشن آرا بھی متاثر ہوئی اور سیاسی توڑ جوڑ میں ماہر ہوگئی۔

تخت نشینی کے وقت شاہجہاں نے جہاں آرا بیگم اور دیگر بیگمات کے ساتھ روشن آرا کو ایک لاکھ روپے بطور انعام اور پچاس ہزار کا وظیفہ اور جاگیریں عطا کیں مگر ان سب کے باوجود جہاں آرا بیگم کا اقبال بلند رہا تمام محلات کا انتظام ستی النساء، اور جہاں آرا بیگم کے ہاتھوں میں رہا بغیر ان کی اجازت کوئی کام نہیں ہوتا تھا بڑے بڑے راجے مہاراجے امراء جہاں آرا بیگم سے سفارش کرانے تھے منصب دار کا عہدہ بھی جہاں آرا بیگم کے مشورہ سے ہی عمل میں آتا تھا۔ یہ مقام روشن آرا بیگم کو حاصل نہ تھا۔ جہاں آرا بیگم داراشکوہ کو جانشین بنانے کی حامی تھی۔

اور کئی بار اس نے داراشکوہ کے لیے بادشاہ سے سفارش بھی کی۔ روشن آرا بیگم میں بھی دور اندیشی کی کمی نہ تھی وہ دربار کے ماحول کا تجربہ بھی رکھتی اور عالمگیر کی خوبیوں سے بھی بے خبر نہیں تھی اسی لیے وہ عالمگیر کی حامی تھی۔

بادشاہ کی بیماری، شجاع کی ناکامی اور سموگڈھ کی فیصلہ کن جنگ کے بعد جب عالمگیر کو مٹانے کی خوفناک سازش ہو رہی تھی تو روشن آرا بیگم نے بھی قبل از وقت عالمگیر کو اس سازش سے خبردار کر کے اسے تباہی و بربادی سے بچایا۔ شاہجہاں نے فاضل خاں اور خلیل اللہ خاں کی معرفت عالمگیر کو پیغام بھیجا کہ اسے ولی عہد بنایا جا رہا ہے روشن آرا نے عالمگیر کو اس سازش سے آگاہ کر دیا اور عالمگیر نے خلیل خاں کو اپنا طرفدار بنا لیا فاضل خاں ناکام واپس چلے آئے اور پھر عالمگیر نے سلطان محمد کے ذریعہ آگرہ کے قلعہ پر قبضہ کرانے کے بعد عالمگیر نے تخت حاصل کر لیا اور بادشاہ شاہجہاں کو نظر بند کر لیا گیا۔

عالمگیر کے تخت حاصل کرنے کے بعد روشن آرا کا سیاسی وقار بلند ہو گیا۔ دربار میں اس کی طوطی بولنے لگی اسے جاگیریں عطا کی گئیں۔ پانچ لاکھ روپے بطور انعام دیا گیا مگر چند ہی دنوں کے بعد دربار اور شاہی محل میں روشن آرا کی مخالفت ہونے لگی۔ عالمگیر کی بیماری کے وقت روشن آرا نے اسی طرح تیمارداری کی جس طرح جہاں آرا نے شاہجہاں کی بیماری کے وقت کی تھی۔ روشن آرا کے حکم کے بغیر عالمگیر سے کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ اب یہ افواہیں پھیلنے لگیں کہ بادشاہ کی وفات ہو چکی ہے اور اس کے پردہ میں روشن آرا حکومت کا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر برنیر کا بیان ہے کہ روشن آرا نے عالمگیر سے شاہی مہر بھی حاصل کر لی ہے۔ لوگوں کا خیال یہ بھی ہو رہا تھا کہ شہزادہ اعظم ابھی کم سن ہے اس کی اتالیق بن کر اس طرح کام کر رہی ہے جس طرح بیرم خاں نے اکبر کی کم سنی کے وقت کیا تھا۔

روشن آرا نے سلطنت میں امن و امان کو برقرار رکھنے کے لیے فرمان بھی جاری کیا کچھ دن بعد عالمگیر ٹھیک ہو گیا تو خود عالمگیر نے سلطنت کے کاموں کو سنبھالا۔ ۱۰۷۲ھ میں روشن آرا نے عالمگیر کا جشن صحت منایا جشن کی خوشی میں روشن آرا کو کثیر رقم اور جواہرات عطا کیے۔

ڈاکٹر برنیر روشن آرا کے زوال کے اسباب بیان کرتا ہے کہ "عالمگیر کی بیماری کے آخری ایام میں اس کی والدہ عالمگیر کی صحت کے لیے بہت بیقرار تھی وہ رواداری کے لیے عالمگیر کے پاس جانا چاہتی تھی لیکن روشن آرا نے اس کو نہیں آنے دیا... آخر وہ پہرے داروں کو روپے دے کر بادشاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوگئی اور اس بات کی شکایت کی روشن آرا نے اسے آنے سے روکا تھا" اس بات سے عالمگیر روشن آرا سے خفا ہوگیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اب عالمگیر کا دل روشن آرا کی طرف سے بالکل پھر گیا. مگر برنیر کا یہ بیان بے بنیاد اور حقیقت سے دور ہے۔ کیوں کہ عالمگیر اپنی زندگی کے آخری ایام تک روشن آرا کی پہلی جیسی ہی عزت کرتا رہا اور روشن آرا کا اقتدار بھی اسی طرح رہا اور جاگیریں بھی بدستور رہیں۔ روشن آرا عالمگیر کے بچّوں کی آخری وقت اتالیق رہی ۔

روشن آرا شان وشوکت کی دلدادہ تھی اس کی سواری کے جلوس کو دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے، برنیر اس کی سواری کے ایک جلوس کا نقشہ اس طرح پیش کرتا ہے :

"چاہے آپ اپنے تخیل کو وسعت کی انتہائی حدود تک لے جائیں پھر بھی آپ کا دماغ روشن آرا کے جلوس کی صحیح تصویر پیش نہ کر سکے گا وہ پیگو کے ہاتھی پر سنہری ہودہ میں بیٹھ کر نکلتی تھی، ہاتھی طرح طرح زیورات سے آراستہ ہوتا تھا، اس کے پیچھے پانچ یا چھ ہاتھی اور ہوتے تھے، جن پر محل کی دیگر بیگمات سوار ہوتی تھیں، بیگم کے ہاتھی کے گرداگرد تاتاری اور کشمیری عورتیں مختلف ہتھیاروں سے مسلح گھوڑوں پر سوار ہوتی تھیں ان قلمافینوں اور بیگم کے درمیان سب سے بڑا خواجہ سرا نہایت شاندار اور زرق برق لباس پہنے گھوڑے پر سوار ہوتا تھا۔ اس کے بعد پیادے دورباش نیزے اور علم ہاتھوں میں لیے ہوئے جلوس کے ساتھ ہوتے تھے یہ پیادے بیگم کے آگے پیچھے سڑک کے دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ہوتے تھے اس کے بعد اس کے دربار کا سب سے بااثر منتظم کا

گھوڑا ہوتا تھا جس کے عقب میں دو چار اور ہاتھی ہوتے تھے جن پر بیگم کی خاص الخاص کنیزیں سوار ہوتی تھیں۔ آخر میں پچاس ہاتھی ایسے ہوتے تھے جن پر امراء کی بیگمات سوار ہوتی تھیں۔"

روشن آرا کا انتقال ۷، رجمادی الاول ۱۰۸۲ھ کو جمعرات کے دن ہوا اس کے انتقال کے بعد عالمگیر کو بہت صدمہ پہنچا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگے عالمگیر نے ماتمی لباس پہنا اور بہت سا زر ونقد خیرات کیا۔ اس کا مقبرہ دہلی میں واقع روشن آرا باغ میں ہے جو اس کی مشہور یادگار ہے یہ نہایت وسیع اور پر فضا مقام ہے اور دہلی کی مشہور سیر گاہ رہا ہے۔

روشن آرا بیگم کی اخلاق کی نمایاں چیز عالمگیر سے محبت ہے وہ عالمگیر کو دل وجان سے چاہتی تھی اور ہر مصیبت اور خوفناک وقت میں اس کا ساتھ دیا۔ عالمگیر کے اقتدار کے لیے وہ ہر قربانی کو تیار رہتی۔ روشن آرا ذہین ہونے کے ساتھ دور اندیش بھی تھی، تجربہ اور سیاسی شعور بھی رکھتی تھی وہ شاہی شان وشوکت جاہ وجلال عظمت وعزت کو برقرار رکھنے کی قائل تھی، بیگم کو غصہ تو بہت جلد آجاتا تھا مگر کچھ ہی دیر کا مہمان ہوتا تھا۔

شہزادی روشن آرا بیگم شفیق ہمشیرا اور باوفادار رحم دل سرپرست تھی۔ دوسری بیگمات کی طرح اس کی بارگاہ کے بھی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے لیے ہر وقت در کھلے رہتے تھے۔ اپنی آمدنی انھیں کی پرورش پر صرف کرتی تھی۔ وہ مذہب کی بہت پابند تھی نماز کی ادائیگی درود وظائف کی کثرت، قرآن پاک کی تلاوت اور پردے کی پابندی، اس کے اخلاق کے جوہر تھے۔ جو ہماری بہنوں کے لیے راہنمائی کا کام دے سکتے ہیں۔

زیب النساء بیگم

"حقیقت میں تیموری شہزادیوں کے علمی چمنستان کا گل سر سبز زیب النساء بیگم ہے۔" زیب النساء بیگم کا پہلا نام زبیدہ بیگم تھا[1] جو بہت ہی حسین و جمیل شہزادی تھی۔ زیب النساء بیگم دلرس بانو بیگم کے بطن سے ۱۰ شوال ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۹ء کو صبح چار بجے پیدا ہوئی عالم گیر کی یہ پہلی اولاد تھی، دستور کے مطابق زیب النساء کو قرآن مجید پڑھایا گیا۔ اس کام کے لیے اورنگ زیب نے مریم کو رکھا گیا مریم ایک شاہی درباری کی والدہ تھی اور قرآن حافظ تھی[2]۔ زیب النساء کو پہلے قرآن پاک حفظ کرایا گیا قرآن پاک کے حافظہ سے خوش ہو کر اورنگ زیب نے زیب النساء کو تیس ہزار اور مریم کو بیس ہزار اشرفیاں بطور انعام دیں[3]۔

مآثر عالمگیری، عالمگیر نامہ اور مراۃ العالم کے مؤلفین کا بیان ہے کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

"واز تحصیل علوم عربی و فارسی بہرہ تمام اندوختہ"

بزم تیموریہ حصہ سوم میں سید صباح الدین بیان کرتے ہیں کہ زیب النساء بیگم کو ملا سعید اشرف درسی کتب کے علاوہ فقہ، اصول فقہ اور علم حدیث کی تعلیم دیتے تھے ملا سعید اشرف ہی نے زیب النساء کو فن شاعری سکھائی اور شاعری کے بھی وہی استاد تھے۔ فن خطاطی میں شہزادی کو کمال حاصل تھا وہ عالم گیر کی طرح خوش خطی اور خوش نویسی میں بھی ملکہ رکھتی تھی۔ وہ ہر طرح کے خطوط یعنی "نسخ، نستعلیق، اور شکستہ کو بہت ہی خوبصورتی سے تحریر کر سکتی

---

[1] منشی دین محمد "حیات زیب النساء" ص ۱

[2] مآثر الامراء، ج ۲ ص ۸۲۹

[3] مآثر عالمگیری اردو ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی ص ۳۹۴

زیب النسا بیگم

(از قلعه مبارک دهلی)

تھی[1]۔ یہ فن بھی شہزادی نے ملا سعید اشرف سے ہی سیکھا تھا کیوں کہ وہ اپنے زمانے کے عالم ہونے ساتھ ساتھ معروف خوش نویس بھی تھے۔ انگیا کرتی کا ایجاد زیب النساء نے کیا تھا۔

زیب المنشات کے حوالہ سے مخزن الغرائب کے مؤلف کے بیان " زیب المنشات کہ از تالیف الجناب است فقر آن را زیارت نمود " سے شہزادی زیب النساء کی اس تصنیف سے اس کے علمی ذوق وقابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب شہزادی کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ تھا۔ اس کی بیاض ایک حوض میں گر کر ضائع ہو گئی زیب النساء کے نام سے ایک مرقع بھی منسوب ہے جس سے شہزادی کی علمی مجلسوں کا علم ہوتا ہے اور اس میں مشہور کاتبوں اور خطاطوں کے جوہر کے کمالات قطعات اور مصوّروں اور نقاشوں کے ہاتھ کی تصاویر تھیں۔ یہ مرقع بھی مجموعہ کی طرح نایبد ہے۔ اس کے دیباچہ کو ملّا رضا راشد نے لکھا تھا۔ جو خدا بخش لائبریری میں موجود ہے دیباچہ ملی جلی نظم ونثر میں لکھا گیا ہے۔ شہزادی کی مجلسوں میں مختلف علماء وفضلا میں بحث ہوتی تھی۔ دیباچہ سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ شہزادی طب روحانی سے بھی ذوق رکھتی تھی۔ شہزادی علم موسیقی کی بھی دلدادہ تھی اور اس علم سے بخوبی واقف تھی۔

" ز موسیقی واز اکانش آگاہ بگوش استماعشق لیک اکراہ "

شہزادی زیب النساء بیگم کے انشاپردازی اور علمی قابلیت کے بارے میں دیباچہ میں یوں تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بلفظ مختصر معنی مطول — عبارت مجمل و معنی مفصّل

بعلم اولی نر از چیز دانی — نہ دراعمال گنجد حرف ثانی

پروفیسر محفوظ الحق نے بیگم کے مرقع کی نقل رسالہ شمع آگرہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۹۴

سید صباح الدین بزم تیموریہ حصہ سوم میں تحریر کرتے ہیں کہ :

"زیب النساء بیگم کا ذوق شاعری اتنا بڑھا کہ اس کی خدمت میں شعراء اپنے معروضات شاعری ہی میں پیش کرتے تھے۔"

۱۰۹۰ھ میں بیگم صاحبہ نے ابرک کا ایک بڑا خیمہ بنوایا جو مکمل شیشہ کا معلوم ہوتا ہے مولانا شبلی مرحوم لکھتے ہیں کہ :

"بیگم کے درباری شعر و شاعری کے بارے میں عالمگیر کی خشک مزاجی سے شاعری اور شعراء کو جو نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تلافی زیب النساء کے حسنِ مذاق سے ہو گئی تھی۔"

زیب النساء بیگم سے اور چار چھوٹی بہنیں تھیں جن کے نام ہیں :

۱- زینت النساء بیگم ۲- زبدۃ النساء بیگم

۳- بدر النساء بیگم ۴- مہر النساء بیگم

زیب النساء بیگم ایرانی ادب اور شعراء کا بہت مطالعہ کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف زیادہ مائل ہو گئی۔ وہ علم حساب اور علم ہیئت میں بھی اعلیٰ قابلیت رکھتی تھی۔ شہزادی اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ علماء و فضلاء کی امداد میں خرچ کر دیتی تھی۔

زیب التفاسیر جو امام غزالی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ زیب النساء نے اپنے نام سے تصنیف کرائی۔ شہزادی کی اپنی خود کی کوئی تصنیف نہیں تھی۔ لیکن شہزادی کے اہتمام میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں شہزادی بہت ہی سادہ طریقہ سے رہتی تھی زیب و زینت اور ریشمی کپڑوں سے شہزادی کو بہت ہی نفرت تھی چنانچہ ان کو پہننا بالکل پسند نہیں کرتی تھی

زیب النساء کے پاس بہت سی کنیزیں رہتی تھیں مگر زیادہ تر کام خود کرتی تھیں وہ کنیزوں پر بھی خفا نہیں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک کنیز سے جو شاعرہ بھی تھی قیمتی چینی کا آئینہ ٹوٹ گیا۔ کنیز نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"از قضا آئینہ چینی شکست"

زیب النساء نے فوراً مسکرا کر جواب دیا

"خوب شد سامان خود بینی شکست"

زیب النساء بھی حمیدہ بانو بیگم کی طرح شادی کے معاملہ میں آزاد خیال رکھتی تھی۔ وہ اپنے جیسا ہم مذاق اور قابل آدمی کو رفیق حیات بنانا چاہتی تھی۔ عالمگیر کی طرف سے شہزادی کو شادی کے لیے مکمل آزادی تھی، یہ باتیں سب غلط ہیں کہ مغل شہزادیوں کی شادی نہیں کرتے تھے یا انھیں شادی کی اجازت نہیں تھی شہزادیوں کی شادی کے لیے تاریخ میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

زیب النساء کی عمر جب ۲۵ سال کی ہو گئی تو بیگمات نے عالمگیر سے کہا کہ شہزادی سیانی ہو گئی ہے اس کی شادی کر دیجیے، تو عالمگیر نے جواب دیا کہ ہم اپنی نور چشمی کی طینت اور طبیعت سے خوب واقف ہیں وہ کمزور طبیعت کی لڑکی نہیں ہے ہمیں اس کے بدراہ ہونے کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ ہم اسے شادی کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔" (بزم تیموریہ حصہ سوم)

جب بیگمات نے زیب النساء بیگم کو شادی کرنے کے لیے مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ شادی کرے۔" زیب النساء نے جواب دیا کہ لوگ مجھ سے نہیں میری خوبصورتی یا میرے شہزادی ہونے سے شادی کرنا چاہتے ہیں، زیب النساء سے نہیں میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں جو محض زیب النساء سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ زیب النساء کے اس جواب کو سُن کر بیگمات لاجواب ہو گئیں۔

زیب النساء شاہی محل کے پاس باغ میں ہر صبح و شام سیر کو جایا کرتی تھی۔

بیگم کو سیر و تفریح کے لیے اجازت تھی اسی وقت بہت سی حاجتمند عورتیں اپنی درخواستیں پیش کرتیں اسی وقت حاجتمند مرد بھی اپنی درخواستیں پیش کرتے تھے۔ درخواستوں پر ہمدردانہ غور کیا جاتا تھا اور جائز ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ زیب النساء اپنے بھائی بہنوں سے بے حد پیار و محبت کرتی تھی۔ جب شہزادہ اعظم شاہ بیمار ہوا تو زیب النساء نے ہی اس کی تیمارداری کی شہزادی وہی کھانا کھاتی جو بیمار شہزادہ کو ملتا تھا۔

زیب النساء بڑی دیندار، پرہیزگار اور عبادت گزار اور عصمت مآب شہزادی تھی وہ حنفی عقیدہ کو مانتی تھی۔ شہزادی سے متعلق بعض جاہلوں نے بہت سے غلط قصے مشہور کر رکھے ہیں ان قصوں کا مآخذ یورپین مصنفین کی تحریریں ہیں حقیقت میں یورپین مصنفوں نے کبھی اصلیت کو معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اصلیت کو پہچاننا تو ان کے لیے بہت ہی مشکل کام ہے ان خدا کے بندوں نے کچھ سنا غلط کچھ خود غلط حاشیہ آرائی کی۔ چونکہ انگریزوں کے طبقہ کی لایقینی اور لغو تحریرات کو دیکھتا ہے۔ اسی لیے ان پر ایمان رکھتا ہے یورپین مصنفین نے لکھا ہے کہ زیب النساء کو شادی نہیں کرنے دی گئی اس کی وجہ یہ ہی تھی کہ تیموری بادشاہ شہزادیوں اپنی بیٹیوں کی شادیاں بہت کم کرتے تھے۔ کس قدر لغو دلیل ہے۔

ناصر علی، عاقل خاں، شیواجی سے متعلق زیب النساء کی محبت کے — بے بنیاد افسانے جن کو میں تحریر کرنا بھی فضول سمجھتا ہوں۔ اس طرح پھیلائے کہ لوگوں کو یقین آجائے مگر یہ سب افسانے من گھڑت اور جھوٹے ہیں۔ ایسے افسانوں کا مقصد صرف شہزادوں شہزادیوں اور بادشاہوں کے کردار پر بدنما داغ دکھانا تھا وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ شاہی محلات کے قریب جانے تک کی کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ تو عاقل خاں کس طرح محل کے اندر پہنچ گیا۔ وہ تیموری آئین سے ناواقف تھے۔ ان واقعات کا کسی — بھی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا ہے محل کے قریب

غیر مرد تو کیا عورت بھی نہیں جا سکتی تھی۔

ڈاکٹر برنیر جس نے بہت سی بے بنیاد باتیں تحریر کی ہیں وہ دس ہیں :
"اپنے ذاتی تجربہ اور خواجہ سراؤں اور شاہی ملازمین کے ذریعہ حاصل معلومات کی بنا پر قلعہ کی زندگی کے بارے میں لکھتا ہے کہ قلعہ کے دو حصّے ہیں محل اور دوسرا محل سرائے۔ محل سرائے کا پتہ لگانا مشکل ہے، وہاں کسی شخص کا گزر ممکن نہیں۔ ایک مثل مشہور ہے کہ تین موقعوں سے بچنا چاہیے اور احتیاط رکھنا چاہیے۔
(۱) کوتل گھوڑوں سے (۲) شکارگاہ سے (۳) محل سرائے یا بیگمات شاہی کی سواری کے قریب جانے سے (سفرنامہ برنیر جلد دوم ص ۳۵ - اور ص ۳۷۔
برنیر نے محل سرائے کے بارے میں خواجہ سراؤں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حسب مراطب بیگمات کے لیے علیحدہ علیحدہ محلات ہیں جن کے دروازوں کے سامنے حوض باغیچے روشیں فوارے لگے ہوئے ہیں، دریا کی طرف ایک چھوٹا برج ہے جس کا رنگ لاجوردی ہے اور بڑے بڑے آئینے چاروں طرف لگے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ برنیر کو بڑی بیگم کے علاج کے سلسلے میں محل سرائے میں بلایا گیا۔ بیگم شدید علیل تھیں اور باہر کے دروازے تک آنا ممکن نہ تھا چنانچہ برنیر کو اندر لے جایا گیا۔ لیکن اس طرح کہ ایک کشمیری شال اس کے سر سے پاؤں تک ڈھک دی گئی اور ایک خواجہ سرا اندھے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر تک لے گیا۔ (بحوالہ تاریخی مقالات خلیق احمد نظامی ص ۱۸۷)

زیب النساء بیگم جیسی پاک دامن اور مقدس شہزادی سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے اور اس کے علمی کارناموں کی گونج آج تک ہند کے در و دیوار سے پیدا ہو رہی ہے مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ بازاری افواہوں اور گپ شپ تراشوں کی بدولت بیگم کے دامن تقدس کو ہر قسم کے گناہوں سے ملوث کر دیا جبکہ بیگم کی زندگی کا ہر لمحہ خدا پرستی اور علم پروری میں بسر ہوا۔

ملا اشرف ایرانی نے بھی زیب النساء کو چودہ برس تعلیم دی۔ وطن واپسی پر اس نے ایک بلند پایہ قصیدہ لکھ کر بیگم کی خدمت میں پیش کیا، شہزادی نکتہ رس طبیعت کی مالک تھی وہ سیاسی شعور بھی رکھتی تھی۔ عالم گیر کی تاج پوشی کے وقت ایک بیش بہا تحفہ بادشاہ کو پیش کیا تھا بادشاہ نے شہزادی کو انعام کے طور پر چار لاکھ روپیہ عطا کیے۔ تخت نشینی کے وقت بھی زیب النساء کو زر و جواہر عطا کیے۔

کشمیر میں بیگم آباد شہزادی کی جاگیر تھی —— محمد اکبر زیب النساء کا سگا بھائی تھا۔ محمد اکبر کی بغاوت سے عالمگیر شہزادی سے خفا ہو گئے کیونکہ زیب النساء محمد اکبر کی طرف داری کر رہی تھی۔ بیگم نے کام بخش کی شادی آرام بانو بنت سعادت خاں صفوی سے کرائی اور زیب النساء کی ڈیوڑھی پر ہی بارات آئی جس میں عالمگیر اور بہت سے امراء نے شرکت کی۔

زیب النساء درویش مزاج کی شہزادی تھی بہت سادہ سفید لباس پہنتی تھی وہ خود لکھی ہے۔

"دختر شاہم ولیکن رو بفقر آوردہ ام
زیب و زینت بس ہمیں است نام من زیب النساء است"

وہ بڑی نفاست اور نزاکت پسند تھی وہ سخی دل تھی اس کے دست کرم سے بہت سی غریب لڑکیوں، بیوہ اور یتیم بچے وظائف پاتے تھے شہزادی شریعت کی پابند تھی تمام عمر میں اس کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی وہ نوافل اور مستحب بھی بڑے والہانہ شوق سے ادا کرتی تھی بھائی بہنوں کا نام آتے ہی اس کے منہ سے محبت کا آب حیات ٹپکتا تھا۔ ایک طرف بیمار شہزادہ اعظم شاہ کی تیمار داری کا خیال تو دوسری طرف، باغی محمد اکبر کو بھی بہت سے خطوط لکھے۔ جبکہ وہ راجپوتوں سے مل گیا تھا۔ روشن آرا بیگم زیب النساء کی پھوپی کی وفات کے بعد زیب النساء کو سارے محلات کے کام سپرد کر دیے گئے عالمگیر زیب النساء سے سیاسی معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔

"زینت المساجد" واقع دریا گنج جو "گھٹا مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔

اسی مسجد کے شمالی حصہ میں زیب النساء بیگم کا مقبرہ ہے۔ شہزادی اس دنیائے فانی سے ۱۷۰۱ء میں رخصت ہوگئیں۔

عالمگیر کے آخری دور میں تمام ملک میں چاروں طرف بغاوت کھڑی ہوگئیں اس دور میں بیگم کا اقبال بڑی بلندی پر تھا۔ بیگم سے عالمگیر کی ناراضگی جو شہزادہ محمد اکبر کی ناواقفیت، اور ناعاقبت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی وہ بہت جلد ختم ہوگئی۔

ایران، توران، عرب، ترکستان کے علماء و فضلاء بیگم کی شہرت سن کر خود بخود ہندوستان کھنچے چلے آئے تھے۔ تفسیر کبیر کے ترجمہ نے زیب النساء کے نام کو جاوید بنا دیا۔ مولانا غلام علی بلگرامی یدِ بیضہ میں لکھتے ہیں کہ:

"زیب النساء نے اپنی ہمت کو ارباب فضل وکمال کی ترقی میں صرف کردیا۔ شاعروں، منشیوں اور خوشنویسوں کی ایک بڑی جماعت اس کی قدردانی کے سایہ میں پرورش پاکر آسودگی سے زندگی بسر کرتی تھی۔"[1]

ایک بار نعمت خاں عالی جو بلند پایہ کا شاعر تھا اس نے ایک مرصع کلغی فروخت کے لیے بیگم کے حضور میں پیش کیا کلغی کی قیمت ادا کرنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ نعمت خاں نے فوراً ایک قطعہ لکھ کر بیگم کو بھیج دیا۔ بیگم نے پانچ ہزار روپے انعام اور بے کلغی بھی واپس کردی۔ ایک بار بیگم چاندنی میں اپنی خواصوں کے ساتھ آبشار کا لطف اٹھا رہی تھی فضا کی سکون اور منظر کی دلفریبی نے اس کے دل پر اثر کیا اور مندرجہ ذیل اشعار بیگم کے منھ سے بے ساختہ نکل پڑے۔

---

[1] مقالاتِ شبلی ص ۱۱۶

"اے آبشار نوحہ گر از بہر چیستی
چنیں برجبیں فگندہ زاندوہ کیستی

آیا چہ درد بود چوں من تمام شب
سر را نبسنگ میزنی دمی گریستی

زیب النساء نے بہت سے باغات، سرایئں اور عمارات تعمیر کرائیں۔ بیگم کا مشہور باغ نواں کوٹ لاہور میں تھا۔ مگر اب آثار مٹ رہے ہیں۔ یہ باغ ہر طرح سے بہت ہی دلکش تھا۔ اس میں حمام، حوض، فوارے، آبشارے تھے اس کی عمارت قیمتی پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ اس باغ کو نمونہ بہشت بنایا گیا۔ چوبرجی والا باغ، کو بھی عالمگیر نے زیب النساء کو بخش دیا تھا۔

ڈاکٹر برنیر منوچی اور دیگر وہ مؤرخ جنھوں نے مہاراشٹر کے تاریخ کدہ میں بیٹھ کر جو افسانے گھڑے وہ سب کے سب غلط اور بے بنیاد ہیں صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے اپنی کتاب مآثرالامراء میں شیعہ اور سنی تعصب میں مبتلا ہو کر ہر قسم کے ناکردہ گناہ عالمگیر اور اس کی اولاد کے سر تھوپے ہیں مگر ایسے واقعات کہیں نہیں ملتے۔ سر جادوناتھ سرکار نے تمام مرہٹی مآخذوں کو استعمال کیا۔ مگر کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملا کہ زیب النساء بیگم کی سازش سے شیواجی قلعہ سے نکل بھاگا بہت سے غلط افسانے پروپیگنڈہ کے لیے جیسے جہاں آرا عصمت مآب کی طرح زیب النساء عفت مآب کو بھی بدنام کرنے کے لیے تحریر کر دیے ہیں۔ غیر ملکی سفیر بالخصوص یورپ کے مورخ نے ہندوستان میں مسلمانوں، شہنشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے کردار کو اسی طرح کا سمجھا ہو گا جیسے ان کے حکمراں طبقہ اور ان کی خواتین کے کردار ہوتے ہیں۔ غیر ملکی سفیر اور یورپ کے متعصب سفیر شہزادیوں کی تعلیم و تربیت اور علمی زندگی ان کے کردار اور کارناموں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ دل ہی دل میں

بغض اور حسد رکھنے لگے پھر تعصب کے قلم سے ان کے کردار کے بارے میں بھی ایسے من گھڑت جھوٹے بے بنیاد افسانوں سے غلط پروپیگنڈہ کیا تاکہ مسلم پردہ نشین خواتین کے بارے میں دنیا والے اچھی رائے قائم نہ کرسکیں لیکن حقیقت پر پردہ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں تاریخی واقعات خود گواہی دیتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ان سفیروں اور یورپ کے مورخین نے خود اپنے سفرناموں میں غلط باتیں تحریر کرکے ان کی اہمیت کو ختم کردیا اور یورپ کے مورخین نے تو واقعات کو غلط تحریر ہی نہیں کیا بلکہ سمجھا بھی غلط ہے۔ یہ ہی ان کی آنکھوں کا چشمہ ان کے تعصب کا اظہار ہے صلیبی جنگوں کی شکست کے بعد یورپ کے متعصب ادیبوں اور مورخوں نے اپنے تعصب کی نوک قلم سے تلوار کا کام لیا ہے۔

زینت النساء بیگم

"دُخترِ ہند" تصنیف میں مولانا محمد علیم الدین سالک زینت النساء بیگم کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"زینت النساء بیگم عالمگیر کی غیور اور خود دار لڑکی تھی اس کے اخلاقِ حسنہ اور اطوارِ حسنہ کے اثر سے بڑے بڑے امیر کانپتے تھے اور اس کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ اس کے دامنِ تقدس پر فرشتے عبادت کرتے تھے" (ص ۲۲۴)

زینت النساء بیگم ۱۶/اکتوبر ۱۶۴۳ء کو دلرس بانو بیگم دُختر شاہنواز کے بطن سے اورنگ آباد میں پیدا ہوئی۔ زینت النساء بیگم اعظم شاہ کی حقیقی ہمشیرہ اور اورنگ زیب کی چوتھی اولاد تھی عالمگیر نے اپنے تمام بچوں کی تعلیم و تربیت بڑے اعلیٰ پیمانہ پر دلائی وہ چاہتا تھا کہ میری اولاد اسلام کی پرستار ہو۔ اس لیے عالمگیر اپنی اولاد کے لیے اسلامی ماحول چاہتا تھا۔ زینت النساء اپنے والد کی خلف الصدق ثابت ہوئی۔ زینت النساء بیگم کے معارف پروری اور علمی کارناموں سے ہندوستان کی فضا اب تک معطر ہے اور زیب التفاسیر کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

زینت النساء بیگم کا زیادہ تر وقت کلام پاک اور احادیث کے مطالعہ اور عبادت میں بسر ہوتا تھا اس کے زہد و اتقاء قابلِ احترام ہیں بچپن سے ہی اس کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا اور یہی ولولہ آخری دم تک رہا اسے علومِ قرآنیہ پر کافی دسترس تھا۔ زینت النساء بھی جہاں آرا بیگم کی طرح ابا جان کی ہر وقت خاطر و مدارات کرتی رہتی تھی۔ عالمگیر کے بعد اعظم شاہ اپنے بھائی شاہ عالم سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اور شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس وقت زینت النساء بیگم، اعظم شاہ کی بیگمات اور بچوں کے ساتھ گوالیار کے قلعے میں تھیں۔ بادشاہ بنتے ہی شاہ عالم نے حکم دیا کہ تمام بیگمات، زینت النساء بیگم اور اعظم شاہ کے بچوں کو فوراً گوالیار سے آگرہ لایا جائے۔ اعظم شاہ چونکہ زینت النساء بیگم کا سگا بھائی تھا۔ اس کے قتل غم میں

بیگم مبتلا تھی، اسی لیے شاہ عالم کو بادشاہ بننے کی مبارک باد دینے کے لیے اس کے پاس نہ پہنچ سکیں۔ شاہ عالم خود زینت النساء بیگم کی خدمت میں تعزیت کے لیے حاضر ہوا اور زینت النساء کو شاہ بیگم کا لقب عطا کیا، اور وظیفہ کی رقم دوگنی کر دی اس کے بعد بیگم آگرہ سے، دہلی چلی آئیں اور آخری دم تک یہیں رہی۔

شاہ عالم بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ بادشاہ بنا، مگر چند دن کے بعد ہی فرخ سیر نے جہاندار شاہ سے تخت حاصل کر لیا۔ جہاندار شاہ عیش و نشاط میں ڈوبا رہتا تھا۔ لال کنور جو اس کی چہیتی بیوی تھی۔ اس کے زیرِ اثر اس نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لال کنور اہلِ نشاط سے تھی اپنی شوخی اور بے باکی سے جہاندار شاہ کا دل مٹھی میں لے لیا تھا۔ جہاندار شاہ نے لال کنور کو "امتیاز محل کا لقب عطا کیا۔ اس کا بھائی خوشحال خاں کو اکبر آباد کا صوبیدار بنا یا گیا۔

زینت النساء بیگم اس ماحول کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔ جہاندار شاہ کو بھی بہت سمجھایا، مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا، زینت النساء بیگم نے لال کنور کو نہ کبھی بیگم تسلیم کیا نہ کبھی اسے عزّت کی نظر سے دیکھا اور" وابستگانِ دامن کو ہمیشہ حقیر و ذلیل سمجھا۔

فرخ سیر کا ابتدائی دور ہندوستان کی تاریخ کا خونین ورق ہے۔ فرخ سیر زینت النساء کا بڑا احترام کرتا اور ہر کام میں مشورہ لیا کرتا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں زینت النساء بیگم نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ہر وقت اپنے کو عبادت میں مصروف کر لیا۔ سیاست اور دیگر کاموں سے بالکل علیحدہ رہنے لگیں ۸۰ برس کی عمر میں ۱۸ مئی ۱۷۲۱ء کو وفات پائی اور زینت النساء بیگم کو زینت المساجد کے ایک گوشے میں دفن کیا گیا، مگر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کو اس کی قبر کسی اور جگہ منتقل کر دی۔

زینت المساجد بیگم کی زندۂ جاوید یادگار ہے یہ مسجد شاہ جہاں آباد (دہلی) میں بہت مشہور ہے اور دریا گنج میں ایک بلند چبوترہ پر واقع ہے اس کے مینار دور سے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سرخ رنگ کے پتھروں سے بنی ہے۔ چھت سادہ اور تینوں گمبد سنگ مرمر کے بنے ہیں جن میں سنگ موسیٰ کی دھاریاں ہیں۔ مسجد کے سات در ہیں ایک خوشنما حوض ہے مسجد کے صحن میں ہی بیگم کا مزار ہے۔

جو رقم عالمگیر نے نقدی کی شکل میں زینت النساء بیگم کو جہیز میں دی تھی بیگم نے وہ سب رقم اسی مسجد کی تعمیر میں خرچ کردی۔ قبر کے پاس ایک چھوٹا سا برج تھا، قبر کا تعویذ سنگِ مرمر کا تھا۔ قبر کے سرہانے آیۃ کریمہ "قل یا عبادی الذین" کے بعد یہ کتبہ منقوش تھا۔

مونس ما در لحد فضلِ خدا تنہا بس است

سایۂ از ابرِ رحمت قبر پوش ما بس است

امیدوار حسن خاتمہ قائمہ زینت النساء بیگم بنت شاہ محی الدین عالمگیر غازی انار اللہ برہانہ ۱۱۲۲ھ مگر آج وہاں کچھ بھی نہیں۔ مسجد نمازیوں کے لیے محتاج ہے۔

اورنگ زیب کی دوسری بیٹیوں میں زینت النساء کے بعد بقول عالمگیری کہ:

"زینت النساء نے بھی باپ کی توجہ سے فیضِ تربیت سے علمی کمالات حاصل کیے وہ احکامی دینی اور مسائلِ شرعی سے بخوبی واقف و آگاہ تھی[1]"

صبح گلشن میں زینت النساء بیگم کا ذکر ایک شاعرہ کے لیے کیا گیا ہے۔ مؤلف کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"زینت النساء ہمشیر زیب النساء بیگم از بنات اورنگ عالمگیر بادشاہ است عالمہ و شاعرہ و حافظۂ کلام اللہ بود زینت المساجد بنا کردہ اس الی الان در شہر شاہجہاں باد موجود و معمور بر رنگ مزارش کہ در صحن ہمایوں مسجد است" ایں شعر خود دش منقوش و منقول"

شعر پیچھے تحریر کیا جا چکا ہے۔

اورنگ زیب کی بیٹی بدر النساء بیگم اور زبیدۃ النساء بیگم نے ہمیشہ طاعت و عبادت و تحصیلِ علم میں عمر بسر کیں اور ذخیرۂ سعادت فراہم کرتی رہیں وہ حافظِ قرآن اور علم دین سے مالا مال تھیں، انھوں نے علم کے ساتھ عمل کو بھی محفوظ رکھا۔

"ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ کی بیویاں اور ہندو رانیوں کے مصنف نے اس کتاب کے صفحہ نمبر ۶ پر تحریر کیا ہے کہ زینت النساء کی شادی اورنگ شاہ ولیٔ ترکستان سے ہوئی تھی[2]"

---

[1] ماثر عالمگیری ص ۳۹۵

[2] مرزا محمد بیگم کی وفات ۲۲ رجب ۱۱۳۲ھ لاہوری نے یکم شعبان ۱۱۳۲ھ

نور جہاں بیگم

"نگہ بلند سخن دل نواز جاں پر سوز ۔ یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے"

عورت کا عزم اور ارادے کے مقابلے میں جری سپاہیوں کی دلیری فوجوں کی کثرت توپوں دآتش بازی کی گرج شمشیر وشنا کی جھنکار، گھوڑوں کے ٹاپوں کی خوفناک آواز اور شاہانہ جاہ وجلال کچھ حقیقت نہیں رکھتے بھارت کی غیرفانی ہستیوں میں نور جہاں کا نام ہمیشہ ممتاز نظر آئے گا اس کی قربانی اور مخلصانہ کارنامے ہندوستان کے دل پر زرّین حروف سے لکھے جاچکے ہیں۔ اس کی زندگی کے حیات افروز واقعات زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ عورت کے نازک بازو اور کمزور ہاتھ شیر خوار بچوں کا پنگھوڑہ ہلایا کرتے ہیں اور کبھی یہی ہاتھ قوموں، سلطنتوں اور انسانوں کی قسمت کا فیصلہ بھی کیا کرتے ہیں۔

نورجہاں تیموری خاندان کا چشم وچراغ تو نہ تھی مگر تیموری شہنشاہ جہاں گیر کی شریکِ حیات بن کر حرم اور حکومت کے لیے زیب وزینت بنی۔ اگر بیگم نور جہاں کا مغل شہزادیوں کے ساتھ تذکرہ نہ کیا گیا تو ناانصافی ہوگی اور یہ کتاب بھی نامکمل ہوگی اور یہ تاریخ کی بڑی بھول سمجھی جائے گی۔ نورجہاں کی سرگرمی کردار وعمل کی تصویر میں بہت سے پہلو شامل تھے۔

خواجہ غیاث بیگ مغربی تاتار (تہران) کے ایک معقول تعلیم یافتہ اعلیٰ خاندان کا شخص تھا جس نے اپنی ہی جیسی ایک شریف عورت سے شادی کی اور انتہائی عسرت کی حالت میں اس نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ (غیاث بیگ کے) والد کا نام خواجہ محمد شریف تھا۔ خواجہ محمد شریف پہلے خراسان کے صوبے دار محمد خاں کتلو کا وزیر تھا۔ محمد خاں کتلو کی وفات کے بعد شاہ تہماسپ صفوی کے یہاں خواجہ محمد شریف نے ملازمت کرلی۔ جہاں اسے یزد کی وزارت حاصل ہوئی خواجہ شریف کے دو بیٹے تھے۔

(۱) آقا طاہر (۲) مرزا غیاث

۱۵۷۷ء میں خواجہ محمد شریف کا انتقال ہوگیا۔ تو مرزا غیاث نے ہندوستان کا رُخ کیا۔
جب مرزا غیاث قندھار آیا تو اس مصیبت کی گھڑی اور سفر کی حالت میں مہرالنساء (نور جہاں) کی ولادت ہوئی اس مصیبت کی گھڑی میں بیٹی کی حالت بہت ہی گراں گزر رہی تھی۔ مگر بچی کی قسمت کہ مرزا غیاث ہندوستان پہنچ کر فتح پور میں اکبر کی خدمت میں پیش ہوا۔ مرزا غیاث اپنے زمانہ کا مشہور شاعر، ادیب، عالم ذہین، سخی طبیعت اور رحم دل انسان تھا۔

نور جہاں ایک علم پرور باپ کی بیٹی اور اعلیٰ مصور اعلیٰ شاعر اعلیٰ ادیب و انشا پرداز کی شریکِ حیات تھی، اس طرح باپ کی وراثت اور شوہر کی رفاقت سے اس کی علمی شعور اور لیاقت و صلاحیت کو اتنی جلا ملی کہ اب تک اس کی استعدادِ علمی اور سخن سنجی کی داد دی جاتی ہے، اپنے والد کی طرح نور جہاں بھی دل کی فیاض تھی فیشن کی دلدادہ تھی شوہر پرستی کی خوبی قابلِ تعریف تھی۔ اپنے اقتدار کے بعد نور جہاں نے مذہبی زندگی اختیار کر لی تھی۔ وہ کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی تھی۔ اس کی سیرت سے یہ بالکل ہم آہنگ تھا کہ وہ سخت جاہ طلب تھی۔ وہ ان مستحکم پسند ذہن افراد میں تھی جو اپنی قوت کے سرمایہ سے آگاہ ہوتے ہیں۔" علمی استعداد بھی نور جہاں میں بے پناہ تھی۔ اس میں حیرت انگیز محنت کرنے اور محنت کرانے کی صلاحیت تھی جو کام کرتی وہ محنت اور دل سے کرتی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتی تھی۔ اس کی حسنِ تدبیر اور حاضر دماغی خطرہ کے وقت بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ کئی بار اس کی زندگی خطرہ میں آئی مگر دانشمندی سے کام لیا۔ اور اس نے اپنے حسن کی شادابی کو بدستور قائم رکھا، قدرت کی عطا کردہ رعنائی اس میں مفقود نہ تھی، ایران کے بے بہا حسن کی زیبائی اور خدو خال کی مزاجی اور اعلیٰ دلکشی نے اور چمکا دیا تھا مصوروں نے اس کے خدو خال کی رعنائی آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیے ہیں اور اپنی ساری صلاحیت صرف کر دی ہیں۔ نور جہاں کا نام آتے ہی ایک نازک بیضاوی چہرہ کشادہ پیشانی، بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں اور باریک لب نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کی صحت ہمیشہ اچھی تھی وہ گھوڑے پر سوار حکومت اور شکار کرتی تھی اور مضبوط ہاتھ سے نشانہ لگاتی تھی۔" (تاریخِ جہانگیری صد ۱۸۶-۱۸۵)

علی قلی بیگ جو شاہی دربار کا ملازم تھا اکبر نے مہرالنساء سے شادی کرادی جہانگیر کے عہد میں علی قلی بیگ کو اعلیٰ منصب اور شیر افگن کا خطاب عطا کیا گیا اور اسے بنگال کی جاگیر بھی عنایت کردی گئی۔ مگر جب شیر افگن نے جہانگیر کے خلاف بغاوتِ علم بلند کیا تو بادشاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے قطب الدین کو بنگال بھیجا مقابلہ میں قطب الدین کے ذریعہ شیر افگن کا قتل ہوگیا۔ شوہر کے قتل کے بعد نورجہاں جہانگیر کے دربار میں واپس آگئی اور اپنی والدہ کے پاس رہنے لگی، اس وقت مرزا غیاث کو اعتماد الدولہ کا خطاب مل چکا تھا۔

۱۶۱۱ء میں خوش نصیب مہرالنساء کی شادی جہانگیر سے ہوئی، بیگمات اور شاہی محل اور جہانگیر کے دل ودماغ پر ایسا اثر ہوا کہ مہرالنساء کو جولائی ۱۶۱۱ء میں نور محل اور مارچ ۱۶۱۶ء میں نورجہاں کا خطاب عطا کیا گیا۔ سرٹامس رو کا بیان ہے۔ "جہانگیر جو معتدل اور سادہ لوح انسان ہے نورجہاں سے شادی کر کے اس کی محبت کا قیدی ہوگیا۔ اب وہ ایک کان سنتا ہے"[1]۔

ٹیری کا بیان ہے کہ نورجہاں نے اپنی محبت سے اتنی فتح حاصل کرلی کہ جہاں گیر کی محبت پر تقریباً پورا قبضہ کرلیا وہ مملکت میں جو چاہتی تھی کرتی تھی چنانچہ اس نے اپنے بھائی آصف خاں اور دوسرے قریبی عزیزوں کو اقتدار وعزت اور منافع کے بلند ترین درجوں تک سلطنت میں پہنچا دیا[2]۔ اورنگ زیب کے عہد میں ڈاکٹر برنیر کا بیان ہے کہ :

"جہانگیر کی ملکہ (نورجہاں) نے بہت دنوں تک ملک پر حکمرانی کی"۔

تمام مبصرین ملکی اور غیر ملکی بالاتفاق راوی ہیں کہ نورجہاں کی سلطنت پر پوری حکمرانی ہے وہ کبھی جھروکہ میں بیٹھی تھی حکام کو احکام نافذ کرتی تھی اور سفیروں کی پذیرائی کرتی تھی کبھی سکوں پر اس کا نام ہوتا تھا اور اکثر فرامین اس کے نام سے جاری ہوتے تھے، اگر وہ منصب داری کے زمرہ میں

۱۔ اقبال نامہ ص ۵۶-۵۷ الیٹ وڈاوسن ج ششم ص ۴۰۵ تمتہ وقائع جہانگیری الیٹ وڈاوسن ص ۳۹۸-۳۹۹۔ مآثر جہانگیری (مخطوط خدا بخش ص ۷۶-۷۷)

۲۔ بحوالہ تاریخ جہانگیر ص ۱۹۵۔

شامل ہوسکتی تو اپنی جاگیروں کے لحاظ سے تیس ہزار کے منصب پر ہوتی اس کی سرپرستی کا انحصار اس کے رفیقوں پر تھا۔" [۱]

معتمد خاں کا بیان ہے کہ سارے سکّوں پر نور جہاں کا نام ہوتا تھا اور سارے فرامین اسی کے نام سے جاری ہوتے تھے مگر یہ بات بالکل غلط ہے کیوں کہ لین پول وہائٹ وہڈ نے سکّوں کی جو فہرست مرتب کی ہے، ان میں سے بہت سے سکّوں پر نور جہاں کا نام نہیں ہے اس کے نام سے جو سکّے مضروب ہوئے ان پر یہ لکھا تھا (بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور، بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر) [۲]

محمد ہادی ایلیٹ و ڈاؤسن' اور اقبال نامہ کے مصنّفین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ نور جہاں تمام مصیبت زدہ افراد اور بے یار و مددگار لڑکیوں کی پناہ گاہ تھی"۔ کسی مظلوم کا حال سن کر اس کی مدد کرتی تھی ہر یتیم لڑکی کی شادی کے اخراجات کا بوجھ اٹھاتی تھی اس نے اپنے زمانے میں آٹھ سو لڑکیوں کی شادی کرائی' اور دیگر ضرورتوں اور اخراجاتِ جہیز کی تعداد بے شمار تھی۔ نور جہاں حسین ہونے کے ساتھ بے پناہ ذہین بھی تھی نظامِ سلطنت کے مسائل کو فوری حل کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی شہنشاہ نے خطاب بانٹنے کا کام بھی نور جہاں کے سپرد کر دیا تھا۔ سلطنت کے سبھی واقعات نور جہاں کے گرد گردش کرنے لگے۔

نور جہاں کا جہانگیر سے شادی اور اس کا ملکہ بن جانا جہانگیر کی زندگی کا ایک اہم دلچسپ اور تاریخی واقعہ مانا جاتا ہے۔ اس شادی کے بارے میں مورخین کی مختلف رائے ہے۔ ڈی۔ لٹ کا بیان ہے "کہ جب مہرالنساء کنواری تھی تب ہی سے جہانگیر اس پر عاشق تھا لیکن اکبر کی حیات میں ہی مہرالنساء کی سگائی شیر افگن سے ہوگئی اور اکبر نے جہاں گیر کو شادی کی

---

[۱] اقبال نامہ ص ۵۷-۵۶' ایلیٹ و ڈاؤسن ج ششم ص ۴۰۵ تمتہ وقائع جہانگیری ایلیٹ و ڈاؤسن ص ۳۹۹-۳۹۸- مآثر جہانگیری (مخطوط خدا بخش ص ۷۶-۷۷)

[۲] بحوالہ تاریخ جہانگیر ص ۱۹۵

اجازت نہیں دی لیکن عشق چلتا رہا۔

۱۔ صرف شبہ کے الزام میں قطب الدین سے شیر افگن کو قتل کی سزا دلانا۔ جہانگیر کے لیے مناسب نہیں تھا جبکہ شیر افگن کو اس کی ناراضگی کا سبب تک نہیں بتایا گیا۔

۲۔ جہانگیر کی ناراضگی صاف عیاں ہے کہ اسنے بذاتِ خود اس واقع کے بارے میں کچھ بھی تحریر نہیں کیا۔ اس شادی کے اہم واقع کے بارے میں جہانگیر کیوں خاموش ہے یہ بات سمجھ سے باہر ہے۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے خیالات کے برخلاف ڈاکٹر بینی برساد نے بڑی قابلیت اور اس زمانہ کے مؤرخین کے مطالعے کے بعد جہانگیر اور نورجہاں کے عشق کی جھوٹی داستانوں اور افسانوں کو بے نقاب کر دیا اور سچائی کے ساتھ تحریر کیا کہ اصلی تاریخ یہ ہے کہ :۔

۱۔ عہدِ جہانگیری کے کسی بھی مورّخ نے یہ الزام نہیں لگایا کہ جہانگیر نورجہاں پر عاشق تھا۔

۲۔ شاہجہاں کے عہد کے مورخین جو نورجہاں سے حسد بھی رکھتے تھے کسی نے بھی نورجہاں اور جہانگیر کے عشق کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

۳۔ اس زمانے کے یورپ کے مؤرخین نے بھی جہانگیر کو مجرم قرار نہیں دیا ہے۔

۴۔ اگر جہانگیر نورجہاں پر شادی کے پہلے سے ہی عاشق ہوتا تو علی قلی (شیر افگن) کو نورجہاں سے سگائی کے بعد ملازمت سے الگ کر دیتا اور اپنے رقیب کے عہدہ کو بھی بلند نہیں کرتا۔

۵۔ نورجہاں کے کردار کی پاکیزگی بتاتی ہے کہ اسنے اپنے شوہر کے قاتل کے سامنے کبھی بھی سر تسلیم خم نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ نورجہاں جہانگیر سے بے حد انسیت رکھتی تھی

آخر میں پوری بحث کے بعد ڈاکٹر ایشوری پرشاد بھی اسی نیجہ پر آتے ہیں کہ جہانگیر کے بارے میں کوئی بھی مستند ثبوت نہیں ملتا جس سے اسے شیر افگن کے قتل میں ملزم قرار دیا جا سکے۔

جب نورجہاں نے سلطنت کا کام سنبھالا اس وقت اس کے عہدہ سے صرف خرم کا عہدہ بلند تھا۔ نورجہاں کا بھائی آصف خاں اس زمانے کا معروف ادیب اور عالم تھا۔

بقول ڈاکٹر بینی پرشاد کہ " فائنیس کے معاملے میں آصف خاں کے مقابلہ کا پوری سلطنت میں دوسرا نہیں تھا "

جب ۱۶۲۲ء میں آصف خاں کی بیٹی ارجمند بانو کی شادی خرم سے ہوگئی تو اس شادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب شہزادہ خرم، آصف خاں اعتمادالدولہ اور نورجہاں کی پارٹی بہت ہی منظم اور مستحکم ہوگئی اور دس سال تک ملک کی سیاست پر ہر طرف اسی گروہ کا اثر دکھائی دیتا ہے مکمل اقتدار کے ساتھ انھیں چاروں نے حکمرانی کی۔ اس زمانے کے مورخین نے اس دور کو " نورجہاں کے زمانے کے نام سے تاریخ میں تحریر کیا ہے :

" مرزا غیاث کو اعتمادالدولہ کا خطاب بھی نورجہاں کی بدولت ملا "

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نورجہاں کے دور کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں :

(۱) ۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۲ء تک اس دور میں نورجہاں کے والدین حیات تھے وہ ہر طرح سے نورجہاں کے کاموں پر نگہداشت رکھتے تھے اس دور میں شہزادہ خرم نورجہاں کے ساتھ تھا۔

دوسرا دور ۱۶۲۲ء سے ۱۶۲۷ء تک چلتا ہے اس دور میں جہانگیر کی صحت خراب ہوچکی تھی اس کی کوئی طاقت یا حیثیت نہیں رہی تھی۔ یہ زمانہ دربار میں گروہ بندی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ دربار دو گروہ میں تقسیم تھا اس دور میں شہزادہ خرم نورجہاں سے خلاف ہوگیا کیوں کہ نورجہاں نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افگن سے پیدا تھی اس کی شادی شہریار سے کردی تھی اور نورجہاں شہریار کو تخت کا وارث بنانے کی سازشوں کے تانے بانے بن رہی تھی مگر شہریار جو نہایت نااہل، کاہل اور عیش پرست تھا نہ اس کو تخت و تاج کی کوئی پرواہ تھی نہ اپنے کو اس کا اہل سمجھتا تھا اور — اس وقت شہریار دارالخلافہ سے بہت دور تھا۔ تمام ملک میں سورش برپا تھی۔ نورجہاں کے بے جا اثر سے مہابت خاں جو اس دور کا مشہور امیر تھا۔ خلاف ہوگیا اور خرم کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ عبدالرحیم خاں خانِ خاناں نورجہاں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اچانک جہانگیر کا ۲۹ ر اکتوبر بروز اتوار ۱۶۲۸ء کو بمقام راجوڑی میں انتقال ہوگیا۔ اس وقت دربار کے حالات تیزی سے تبدیل ہونے لگے، بادشاہ کی موت کے بعد تخت نشینی کا مسئلہ درپیش تھا۔ نورجہاں کو اس نازک وقت کا اندیشہ تھا اسی لیے

وہ جان توڑ کر کوشش کر رہی تھی کہ اس کا اقتدار قائم رہے سخت مزاجی کی وجہ سے بھی وہ خرم کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ شہریار کے مزاج میں لچک بھی تھی اور بانکپن بھی شہریار کے پاس نورجہاں نے لڑائی کی تیاری کے لیے ایک قاصد بھیجا دوسری طرف وہ اپنے بھائی آصف خاں کو بھی گرفتار کرنا چاہتی تھی آصف خاں جو بہت ہی دوراندیش اور دانشور تھا خرّم کو بادشاہ بنانے کی فکر میں لگ گیا۔ ملک میں سورش، مخالفت اور بغاوت کے اسباب خاندانی گروہ بندی باہمی مخالفت، حسد، نورجہاں کا بے جا اثر اپنے لوگوں سے خالی عہدوں کو بھرنا اور حقدار اور لائق امراء کو دربار سے الگ کر دینا تھا۔

جب خرّم کی شادی ۱۶۱۲ء میں ارجمند بانو سے ہوگئی تو حالات بالکل ہی بدل گئے خرّم کی پرورش اس کی دادی رقیہ بیگم نے کی تھی اکبر خرّم کو بہت لاڈ پیار کرتا تھا اکبر نے خرّم کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی اور اس کے لیے "اتالیق مقرر کیے"۔

(۱) تاتار بیگ کو ترکی زبان (۲) یونانی فلسفہ کے لیے حکیم دوانی گیلانی (۳) مذہبی اور غیر علوم کے لیے استاد قاسم بیگ تبریزی (۴) شیخ مبارک کے شاگرد ابوالخیر نے تیراندازی اور شمشیر زنی کے لیے میر مراد دکنی اور راجہ شالی باہمن نے ذمہ داری لی۔

شہزادہ ہمیشہ اپنے اساتذہ بالخصوص حکیم دوانی کے احسانات کا بہت اعتراف کرتا تھا لیکن زندگی میں کامیابی اس کی اخلاقی قوت اور کردار کی بلندی سے ہوئی جو اسے اپنے دادا سے ورثہ میں ملی تھی"۔[1]

شہزادہ خرّم پرہیزگاری کی تصویر تھا۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی اور انکساری ٹپکتی تھی۔ وہ شان و شکوہ اور طمطراق کا بڑا دلدادہ تھا۔ جہانگیر خود اس کی بارات لے کر آصف خاں کے گھر گیا تھا اور ایک دن اور ایک رات وہاں قیام کیا۔ ارجمند بانو بیگم بھی بہت ہی ہنس مکھ تھی کبھی آزردگی اس کے چہرہ سے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ نورجہاں کو قدرت نے حکمرانی کی پوری صلاحیت عطا کی تھی۔

---

[1] محمد قزوینی، بادشاہ نامہ

تاریخ شاہد ہے کہ نور جہاں ایک اعلیٰ ادیبہ اور اعلیٰ شاعرہ تھی اور وہ شعراء کی سرپرستی بھی کرتی تھی اپنی سگی بہن پنجہ بیگم کے شوہر نواب قاسم خاں کی بحیثیت ایک شاعر بہت قدرداں تھی اور اس کی ہر طرح سرپرستی کرتی تھی۔ نور جہاں نے بہت سے شعراء کو دربار میں متعرف کرایا اور بہت سی عورتیں جو شاعری میں شغف رکھتی تھی وہ نور جہاں کی دسترس میں تھیں۔ اس زمانہ میں مہر ہروی بدیہہ گوئی کی معروف شاعرہ تھی اس کی صلاحیت کی نور جہاں نے خود تعریف کی ہے۔ نور جہاں نے مہر ہروی کو بھی انعام واکرام سے نوازہ تھا[1]

مہر ہروی کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

حل ہر نکتہ کہ ہر چیز خرد مشکل بود ... آزمودیم بیک قطرۂ مے حاصل بود
گفتم از مدرسہ پرسم سبب حرمت مے ... دو ہر کس کہ زدم بے خود دلا انفعل بود
خواستم سوزِ دل خویش بگویم با شمع ... داشت او خود بزباں آنچہ مرا در دل بود
در چمن صبح دم از گریہ وزاریٔ من ... لالہ سوختہ خوں در دل و پا در گل بود
آنچہ از بابل و ہاروت روایت کردند ... سحر چشم تو بدیدم ہمہ را شامل بود
دوئے بود تماشائے راحت مہر را ... حیف و صد حیف کہ ایں دولت مستعجل بود

" مرأۃ الخیال کا موئف نور جہاں کی سخن گوئی و شعر فہمی و حاضر جوابی کی تعریف کرتا ہے نور جہاں کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کی تصدیق مآثر الامرا اور منتخب اللباب سے بھی ہوتی ہے نور جہاں کی حاضر جوابی کے لطیفے آج تک علمی مجلسوں میں مشہور رہیں۔ شاہی حرم میں داخل ہوتے ہی نور جہاں نے اپنے جمالیاتی ذوق سے حرم کی عورتوں کا سارا مذاق ہی تبدیل کر دیا۔ بناؤ سنگار، زیورات لباس پوشاک فرش وفروش اور زیور و عیش و عشرت و آرائش میں اتنی جدتیں پیدا کیں کہ پورے ہندوستان پر یہی رنگ غالب آ گیا۔ عطر بھی نور جہاں کی گلفشانی ہے۔ جہانگیر کی وفات کے بعد نور جہاں کی جہانداری کا دن بے نور ہو گیا۔

---

[1] مرأۃ الخیال ص ۳۳ـ۵

حقیقت میں نورجہاں فیشن کی ملکہ تھی اسی کے ساتھ ساتھ قدرت نے اس کو علم و ادب کی دولت سے مالا مال کیا تھا، نورجہاں بدیہہ گوئی شاعری میں اپنے عہد کی خود ہی مثال تھی ایک دن جہانگیر نے لباس تبدیل کیا جس کا تکمہ "لعل بے بہا" کا تھا۔ نورجہاں کی جیسے ہی اس پر نظر پڑی فوراً مندرجہ ذیل شعر پڑھا۔

"ترا نہ تکمۂ لعل است بر قبائے حریر
شدہ است قطرۂ خون منت گریباں گیر"

ایک بار جہانگیر نے عید کا چاند دیکھ کر یہ مصرعہ موزوں کیا:

ہلالِ عید براوجِ فلک ہویدا شد

فوراً نورجہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ پڑھا:

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد[1]

نورجہاں کی بدیہہ گوئی کی مثالیں مفتاح التواریخ مؤلف "سر ٹامس ولیم بیل میں بھی ملتی ہیں۔

ایک بار نورجہاں نے کئی دن بعد جہانگیر کو دیکھا تو خوشی سے نورجہاں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو رواں ہو گئے۔ جہانگیر نے اس کیفیت کو اس طرح قلمبند کیا ہے۔

گوہر ز اشک چشم تو غلطیدہ می رود

نورجہاں نے فوراً ہی فی البدیہہ مصرعہ موزوں کیا۔

آبے کہ بے تو خوردہ ام از دیدہ می رود

ماہ محرم ۱۰۲۸ھ میں ایک دم دار ستارہ نظر آیا نورجہاں نے اسے دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا۔

"ستارہ نیست بدیں طول سر بر آوردہ فلک بشاطری شہ کمر بر آوردہ"

"یہ سب روایتیں صرف مفتاح التواریخ میں تحریر ہیں کسی دوسرے تذکروں میں نہیں ملتیں، تیموری خاندان کی جو بھی شہزادی شاعری کرتی ہے وہ اپنا تخلص مخفی رکھتی ہے یہ بات قابل غور اور حیرت انگیز ہے۔

---

[1] بحوالہ بزم تیموریہ حصہ سوم۔

یہ بات مراۃ الخیال اور منتخب اللباب کے مؤلفین نے کہی ہے۔ مآثرالامراء کا مؤلف بھی یہ ہی بات تحریر کرتا ہے کہ نورجہاں کا تخلص مخفی تھا۔[۱]

یہ ہی مؤلف نورجہاں کے مندرجہ ذیل اشعار نقل کرتا ہے۔

"دل بصورت ندہم ناشدہ است معلوم = بندہ عشقم و ہفتاد و دوملت معلوم"

زاہدا ہولِ قیامت مفگن در دلِ ما ہولِ ہجراں گذرا ندیم قیامت معلوم

(ج اول ص ۱۲۴)

مفتاح التواریخ میں اس طرح نقل ہے۔

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار است کلید قفل دلِ ما تبسم یار است

نہ گل شناسد و نہ رنگ و بو دنہ عارض و زلف دل کے بجسن دادا گرفتار است

مندرجہ ذیل شعر کو مفتاح التواریخ کا مؤلف نورجہاں کا بتاتا ہے جبکہ کسی دوسرے نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

نورجہاں گرچہ بصورت زن است در صفِ مرداں زنِ شیر افگن است

خاں احمد حسین خاں نے اپنی تصنیف " رانیاں اور شہزادیاں" میں تحریر کیا ہے کہ جب نورجہاں اور جہانگیر کی محبت کا نورجہاں کی والدہ کو علم ہوا تو نورجہاں کی والدہ نے بیٹی کو شاہی محل میں لے جانے سے روک دیا اس کا جب اکبر کو علم ہوا تو اکبر نے سلیم کو نصیحت کی کہ بیٹا بادشاہوں پر واجب کہ ملازموں کی بہو بیٹیوں کو اپنی بہو بیٹیاں سمجھیں اگر ہم ایسی باتیں کریں گے تو دنیا میں آج ہی قیامت آجائے گی۔ تمہیں بھی ایک دن بادشاہ ہونا ہے۔ خبردار ایسا پھر کبھی خیال نہ کرنا۔ (جلد اول ص ۱۳۴) اس کے بعد مہرالنساء کی شادی شیر افگن سے کردی

شیر افگن کے انتقال کے بعد جہانگیر نے اس کو ہر شب چراغ کے پاس ایک بی بی کو شادی کا پیغام لیکر بھیجا یہ بات سن کر مہرالنساء کے آنکھوں میں آنسو آگئے وہ غیور خاتون بولی کہ شیر افگن جیسے خاوند کو گنوا کر دوسرے کا منہ دیکھنا ننگ و وفا و فاحشہ کالا کرنا ہے بی بی تم جاکر میری طرف سے حضور میں عرض کروں کہ خیر جہاں پناہ اس بدنصیب پر جو کچھ گزرگئی اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا مگر بیوہ و بےکس پر رحم کرو۔ نورجہاں کے اس جواب کی سب نے تعریف کی ہے۔

ممتاز محل

ارجمند بانو بیگم نورجہاں کی بھتیجی (آصف خاں) کی دختر بلند اختر تھی، جس کی ولادت ۹ رجب ۱۰۰۱ھ کو ہوئی۔ شادی کے وقت ارجمند بانو بیگم کی عمر ۱۹ سال ۸ ماہ نو دن کی تھی۔ شہزادہ خرم (شاہ جہاں) سے شادی کے بعد ارجمند بانو بیگم کو پہلے تو عالیہ بیگم بعد میں نورمحل اور ممتاز محل کا لقب عطا کیا گیا اور یہی شاہ جہاں کی سب سے زیادہ چہیتی اور محبوب بیوی بنی۔

قدرت نے اس پری زادی کو تعلیم و تربیت کے ساتھ حسن و جمال سے مالامال تھا۔ ارجمند بانو بذاتِ خود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اپنی پھوپی نورجہاں کی طرح علم و فضل سے خود بھی آراستہ تھی۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی۔ اس میں شعر کہنے کی صلاحیت اور بدیہہ شعر کہنے کی بے پناہ لیاقت موجود تھی۔ اس کا اندازہ ہم اس واقع سے لگا سکتے ہیں جب ایک بار شاہ جہاں جمنا کے کنارے بیٹھ کر دریا کے مناظر دیکھ رہا تھا تو شاہ جہاں نے موجوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ممتاز بیگم سے کہا:

"آب از برائے ویدنت می آید از فرسنگہا"

اس پر ممتاز نے فوراً مصرعہ موزوں کر کے جواب دیا:

"از ہیبت شاہ جہاں مرمی زندہ بر سنگہا"

یہ روایتیں صرف اردو کی کتابوں میں تو ملتی ہیں مگر فارسی اور انگریزی کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔

بیگم کی زندگی کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب نورجہاں کی سیاسی لغزش اور جاہ پسندی کی وجہ سے ہندوستان کا امن و امان ختم ہوتا نظر آتا ہے اور چاروں طرف فساد کے شعلے بھڑکنے شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ وزن رکھتی ہے کہ آصف خاں کو نورجہاں کی بدولت ہی شاہی دربار میں عزت ملی تھی خسرو اور خرم نورجہاں سے ناخوش رہتے تھے۔ جہانگیر شہزادہ پرویز کو سلطنت کا

وارث بنانا چاہتا تھا۔ مگر وہ عیش و نشاط میں غرق تھا اور حکومت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ شہریار نورجہاں کے ہاتھ کی کٹ پتلی تھا۔ نورجہاں نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے کر دی اور ۱۰۳۱ھ میں خسرو کا انتقال ہوگیا۔ خسرو کے انتقال کے بعد نورجہاں کو اپنی دیرینہ خواہش یعنی شہریار کو سلطنت کا ولی عہد بنانے کا موقع نظر آنے لگا۔ نورجہاں نے خرّم کو قندھار مہم پر بھیجنے کا حکم دیا اور مہابت خاں کو کابل سے واپس بلایا جہانگیر اس مہم کو ٹالنا چاہتا تھا کیوں کہ حالات سازگار نہیں تھے اور یہی انتظار کیا جارہا تھا کہ پہلے قندھار کے حالات کا جائزہ لیا جائے اور پھر جنگ شروع کی جائے مگر نورجہاں چاہتی تھی کہ خرم کو کسی طرح شکست کا منہ دیکھنا پڑے۔ خرّم نے نورجہاں کی اس چال کو سمجھ کر ۱۰۳۲ھ کو —— بغاوت شروع کر دی۔ اس بغاوت کے وقت ممتاز خرم کے ساتھ رہی اور ہر طرح مدد کرتی رہی آخر خرّم اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اور ۱۰۳۷ھ کو بادشاہ بن گیا۔ تخت نشینی کے بعد خرّم کو شاہجہاں کا لقب حاصل ہوا۔ شاہجہاں کا پورا نام شہاب الدین محمد شاہجہاں تھا۔ تخت نشینی کی خوشی میں شاہ جہاں نے ممتاز محل کو دو لاکھ اشرفی اور چھ لاکھ روپیہ عطا کیے۔ اور محل کی مہرداری کی خدمت بھی سپرد کی گئی۔

بیگم ممتاز محل کا تیسرا دور ۱۰۴۱ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت شہنشاہ دکن کی مہم پر تھا اسی دوران بیگم دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ عبدالحمید لاہوری اور ملا صالح کا بیان ہے کہ یکایک بیگم کی طبیعت خراب ہوگئی بیگم کا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ بادشاہ فوراً دکن سے آیا حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا، بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ بیگم بچوں کو وصیت کرتی ہوئی دارفانی سے رخصت ہوگئی۔ نعش امانت بطور پہلے دین آباد کے باغ میں دریائے تاپتی کے کنارے سپرد خاک کی گئی۔ اب شاہ جہاں کا بڑھاپا شروع ہوگیا۔ اب لذتِ سلطانی ہی نہیں بلکہ زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ وہ حرم میں جاتا مگر اسی وقت روتا ہوا واپس آجاتا اور کہتا کہ اب کس کی صورت دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوتی بیگم کی موت کے بعد ایک ہفتہ تک دربار نہیں کیا وہ چاہتا تھا کہ پوری سلطنت کو چاروں بیٹوں میں تقسیم کرکے فقیر بن جاؤں اور مجاور بن کر بیگم کی تربت پر بیٹھ جائے۔ اکثر شاہ جہاں کو امراء سے

کہتے ہوئے سُنا کہ اگر سلطنت کا بوجھ میرے کندھوں پر اور رعایا کی پاسداری کا خیال میرے دل میں نہ ہوتا اور شریعت ترک دنیا کی اجازت دیتی تو یقیناً فقیر بن جاتا۔ دو سال تک سر آرام، قیمتی لباس جواہرات درباری زیورات پہننے چھوڑ دیے ہر راگ رنگ ترک کر دیا۔ عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ بیگمات کے جھرمٹ میں ممتاز کی صورت نہ دیکھتا تو بے اختیار رو پڑتا۔ بیگم کی موت سے پہلے شاہجہاں کی ڈاڑھی میں بمشکل بیس بال سفید تھے، مگر بیگم کی موت کے غم میں تھوڑے ہی دنوں میں شاہجہاں کی ساری ڈاڑھی سفید ہو گئی۔ (شاہجہاں نامہ)

۱۰۵۲ھ میں بی بی کا روضہ پچاس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار کیا گیا اور بیگم نعش کو روضہ میں منتقل کیا گیا۔ جسے تاج محل کہتے ہیں۔ اس وقت شاہجہاں ممتاز سے لگاؤ کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے:

"زہے مرقد پاک بلقیسِ عہد — کہ بانوئے آفاق راگشتہ مہد"
منور مقامے چو باغِ بہشت — معطر چو فردوس عنبر سرشست
بصنجش زحالِ معتبر بخور — بجاروپ مژگاں ورش رفتہ حور
جواہر نگاشت دیوار در — ہوا تازہ و نزجو آب گوہر
عمارت گرایں مقدس جناب — ز سرچشمۂ فیض آوردہ آب
بریں بقعۂ پاک والا مقام — ترشح کناں ابر رحمت مدام
اگر عاصی آرد بریں روضہ روئے — کند نامۂ خویش راشت وشوئے
ز رقت نظارۂ ایں مزار — شود چشم خورشید و مہ اشکبار
نمود ایں عمارت بنا روزگار — کہ ظاہر شود قدرت کردگار"

شاہ جہاں نے بی بی روضہ کے اخراجات کے لیے انیس گاؤں وقف کر دیے۔ حقیقت میں تاج محل شکستہ دلوں اور نامرادوں کو درس حیات دے رہا ہے۔ یہ باہمی محبت و خلوص کی یادگار ہے ممتاز محل میں جذبۂ شوہر پرستی بے پناہ تھی۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ جو شوق تعلیم نو اور جدید تہذیب کی بدولت مٹتا نظر آرہا ہے۔ ہماری

لڑکیوں کے دلوں میں بھی شوق پیدا ہو۔ اور وہ ممتاز کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔ ممتاز کی آرزوؤں کا مرکز اور محبت و خلوص کا کعبہ شاہجہاں تھا وہ ہر مصیبت اور ہر حالت میں اس کے ساتھ رہی۔

مولانا سیماب اکبر آبادی نے اس الہام کدۂ تاج میں بیٹھ کر اپنے تاثرات کا اظہار مندرجہ ذیل نظم میں کیا ہے ملاحظہ ہو:

" فضا اے تاج تری دل نشین معلوم ہوتی ہے
میں سچ کہدوں مجھے جنت یہیں معلوم ہوتی ہے
ضیا تیری ضیائے بہترین معلوم ہوتی ہے
تری محراب حوروں کی جبیں معلوم ہوتی ہے
تری بینا اور پھر بے نیازِ انقلاب ایسی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے
تری تابانیوں کا کیوں نہ اس کو معجزہ کہیے
اندھیری رات بھی تو چودھویں معلوم ہوتی ہے
تری تعمیر دیتی ہے نگاہوں کو سکوں کیا کیا
تری تصویر کتنی دل نشین معلوم ہوتی ہے
تیرے نظارے سے جذبے محبت کے لرزتے ہیں
وفاؤ حسن کی تربت یہیں معلوم ہوتی ہے
تری معصومیت جس کو تصوّر چھو نہیں سکتا
مجسم ایک خوبِ مرمریں معلوم ہوتی ہے
اگر ہو گی تو جنت نقل ہو گی ترے باغوں کی
بہارِ خلد تری خوشہ چیں معلوم ہوتی ہے

نمایاں ہیں ہر ایک ذرّہ سے آثارِ درخشانی
یہ خاک اب تک ستاروں کی امیں معلوم ہوتی ہے
یہ وہ ماحول ہے جس کے محیطِ نور میں گھر کر
نگاہِ حُسن اکثر شرم گیں معلوم ہوتی ہے
وہ عظمت جو خفا ہو کر گئی ہے قوم مُسلم سے
حجابِ تاج میں گوشہ نشیں معلوم ہوتی ہے
وہ رفعت جس کا ماتم کر چکی ہے قسمتِ مُسلم
انہیں تسکین گاہوں میں مکیں معلوم ہوتی ہے
وہ لذّت جذب کرتا ہے جو اس منظر سے نظّارہ
محبت کی نگاہِ اولیں معلوم ہوتی ہے
ملحوظ اے سیاحِ روحِ عزتِ شاہی
گیاہ و سبزہ میں خلوت نشیں ہوتی ہے
حقیقت کی یہ وہ منزل ہے جس کے ذرہ ذرہ میں
تجلّی ایک مہمانِ حسین معلوم ہوتی ہے
نظر کے ساتھ سر جھکتا ہے ہر گام پر میرا
مرے سجدوں کے قابل یہ زمیں معلوم ہوتی ہے
یہ عالم محویت کا وقتِ سیرِ تاج ہوتا ہے
کہیں ہوتا ہوں میں دنیا کہیں معلوم ہوتی ہے
جسے سیمابِ ارضِ تاج کہتے ہیں فرشتے بھی
وہ میرے ہی وطن کی سر زمیں معلوم ہوتی ہے

ممتاز محل بہت ہی نرم اور سخی طبیعت خاتون تھی جب اس کی رحمت برستی تھی تو لوگوں کو تختِ دار سے بھی اتار لاتی تھی۔ مغربی مورخوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تاج محل کی عمارت

کامغرب والوں کے دماغوں کی دین ہے مگر یہ بات بالکل غلط ہے کہ تاج محل کو بنانے والا معمار نادرالزماں حامد لاہوری تھا۔ یہ روضہ دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے اور آج تک اس کی خوبصورتی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی ہے۔

ممتاز محل کے بطن سے چودہ بچے پیدا ہوئے۔ (شہزادہ خرم کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی ۱۱ر اگست ۱۶۱۱ء کو پیدا ہوئی تھی جس کا نام پرہیز بانو تھا۔ پرورش رقیہ بیگم نے کی مگر ایک سال بعد اس کا انتقال ہو گیا)۔

۱۔ حورالنساء بیگم ۸ صفر ۱۰۲۲ھ کو آگرہ میں پیدا ہوئی۔

۲۔ جہاں آرا بیگم ۲۱ر صفر ۱۰۲۳ھ کو اجمیر میں پیدا ہوئی۔

۳۔ داراشکوہ ۲۹ر صفر ۱۰۲۴ھ کو اجمیر میں پیدا ہوا۔

۴۔ محمد شجاع ار جمادی الآخر ۱۰۲۵ھ کو اجمیر میں پیدا ہوا۔

۵۔ روشن آرا بیگم ۱۰۲۶ھ کو برہان پور میں پیدا ہوئی

۶۔ اورنگ زیب ۱۵ر ذی قعدہ ۱۰۲۷ھ کو ودھات میں پیدا ہوا۔

۷۔ امیر امید بخش ۱۱ر محرم الحرام ۱۰۲۹ھ کو سرہند میں پیدا ہوا۔

۸۔ ثریا بانو بیگم ۲۰ر رجب المرجب ۱۰۳۰ھ کو پیدا ہوئی اور سات سال کی عمر میں وفات پائی۔

۹۔ ایک اور بیٹا پیدا ہوا جو ۱۰۳۱ھ کو وفات پا گیا۔

۱۰۔ مراد بخش ۲۵ر ذی الحجہ ۱۰۳۳ھ کو ایٹہ میں پیدا ہوا۔

۱۱۔ لطف اللہ ۱۰۳۶ھ ۱۰۳۷ھ میں راہگزر عالم علوی ہوا۔

۱۲۔ دولت افزا ۱۰۳۶ھ میں پیدا ہوئے اور دوسرے سال وفات پائی۔

۱۳۔ ۱۰۳۹ھ ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اسی سال وفات پائی۔

۱۴۔ گوہر آرا بیگم ۱۷ر ذی قعدہ ۱۰۴۰ھ کو پیدا ہوئی (برہانپور)

ارجمند بانو کی نسبت خرّم سے ہو تو گئی مگر اس شادی سے پہلے جہانگیر نے خرّم کی نسبت مرزا مظفر حسین صفوی خانوادۂ اسمٰعیل شاہ ایران کی بیٹی سے کر کے ۲۹ / اکتوبر ۱۶۱۱ء کو شادی کر دی یہاں یہ بات قابلِ غور ہے شہزادہ خرّم کی شادی اپنی پہلی منگیتر (ارجمند بانو) سے نہ ہوئی تو دوسری کی کیا ضرورت تھی اس وقت شہزادہ کی عمر بھی شادی کے قابل نہیں تھی نہ شادی ہی فوراً کر دی گئی۔ صفوی شہزادی سے شادی ایک سال بعد ہوئی اس زمانہ کی تحریروں سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ صفوی شہزادی سے خرّم کی کوئی محبت تھی، سیاسی وجہ بھی پسِ پشت نظر نہیں آتی۔

۳۰ / مارچ ۱۶۰۷ء کو شیر افگن کے قتل کے بعد مہرالنساء قصرِ شاہی میں سلیمہ بیگم کے ساتھ رہنے لگی تھی، گمان غالب ہے کہ جہانگیر — نورجہاں کو دیکھنے کے بعد اپنی تمنا کی درخواست پیش کرنے لگا مگر جہانگیر کامیاب نہ ہوسکا کیوں کہ نورجہاں نے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ جہانگیر اب اس کی بھتیجی (ارجمند بانو) سے نسبت ہونے کے بعد خرّم کی شادی میں دلچسپی چھوڑ دیتا ہے اور نورجہاں کو ایک طرح کی دھمکی دے کر اپنے اثر میں کرنا چاہتا ہے تاکہ نورجہاں کو بھتیجی کی خرّم سے شادی نہ ہونے کا صدمہ پہنچے۔ آخر یہ چال چل کر جہانگیر کامیاب ہوا اور ۲۵ / مئی ۱۶۱۲ء کو خرّم اور ارجمند بانو کی شادی ہوگئی۔ مگر اس بات کا بھی کوئی مستند ثبوت نہیں کہ جہانگیر نے نورجہاں کو حاصل کرنے کے لیے یہ جال پھیلایا ہو یہ تو صرف ڈاکٹر بنارسی پرشاد کا خیال ہے۔ جو قابلِ یقین نہیں۔ ہاں خرّم کی تیسری شادی شاہنواز خاں ابن عبدالرحیم خانِ خاناں کی لڑکی سے سیاسی وجہ سے ۲۳ / اگست ۱۶۱۷ء میں ہوئی۔

ماہم بیگم

نصیرالدین محمد ہمایوں مرزا کی ولادت کابل کے قلعہ میں بروز منگل ۶ مارچ ۱۵۰۸ء کو رات کے وقت ہوئی[1]۔ اس وقت بابر کابل کا حکمراں تھا۔ ہمایوں کے جسم میں بابر کی طرح ایشیا کے دو مشہور فاتح چنگیز اور تیمور کا خون شامل تھا۔ بابر کے والد عمر شیخ مرزا تیمور کی چوتھی پیڑھی اور اس کی والدہ خیرو نگار خانم چنگیز کی تیرہویں پیڑھی میں تھی، اس طرح ہمایوں والدہ کی طرف سے تیمور کی چھٹی پیڑھی اور اپنی دادی محترمہ کی جانب سے چنگیز کی پندرہویں پیڑھی سے تھا[2]۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بابر نے ہمایوں کی پیدائش پر ہی مرزا کی جگہ بادشاہ کا لقب اختیار کیا اسی تاریخ سے مغل شہزادے حکمراں بن جانے کے بعد اپنے نام سے مرزا لفظ کو ہٹا کر بادشاہ لکھنے لگے۔

ماہم بیگم ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ کی چہیتی بیوی اور نصیرالدین محمد ہمایوں کی والدہ تھی۔ ماہم بیگم کی ابتدائی زندگی اور اس کے خاندان کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہو سکی۔ اس زمانے کے سب ہی مورخ ماہم بیگم کے بارے میں خاموش ہیں۔ معاصر مورخین نے صرف یہ لکھا ہے کہ وہ سلطان حسین مرزا اور خراسان کے مشہور درویش شیخ ابو انصر احمد جام کے خاندان سے تھی۔ ابو نصر احمد جام زندہ پیل ایران کے ایک معروف صوفی تھے ان کا جنم ۱۰۴۹ء مطابق ۴۴۱ھ میں ہوا تھا ۲۲ سال کی عمر میں انھوں نے مذہبی زندگی اختیار کی اور پہاڑوں اور صحراؤں میں زندگی بسر کرنے لگے اس کے بعد انھوں نے شادی کی اور ۳۹ لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں جو آخر میں ۱۴ لڑکے اور تین بیٹیاں ہی زندہ رہیں ان کی تصانیف میں رسالہ سمرقندی اور بحر الحقیقت وغیرہ بہت مشہور رہیں۔ ایران اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں ان کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے تیمور اور ہمایوں نے زندہ پیل کی درگاہ کے لیے سفر کیا۔

---

[1] بابر نامہ ص ۳۴۴

[2] ہمایوں نامہ گلبدن بیگم ص ۹۰

اکبر کی والدہ حمیدہ بانو بیگم (مریم مکانی) بھی اسی خاندان سے تھیں[1]۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہم بیگم ایک اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور وہ خاندان تعلیم یافتہ تھا بابر نے ماہم بیگم سے ہرات میں ۱۵۰۶ء میں شادی کی۔ گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں بابر کی نو بیویوں کا ذکر کیا ہے۔

ماہم بیگم کے لیے آکا لفظ کا استعمال ہوا ہے اسی لیے آکا بیگم بھی کہتے تھے آکا لفظ کے معنی ملکہ کے ہیں اور یہ لفظ سردار یا صدر کے لیے استعمال ہوتا تھا[2]۔

بیورج نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ماہم بیگم کے خاندان کا سراغ لگانا مشکل کام ہے[3]۔ بقول ڈاکٹر اشوری پرشاد کہ ماہم بیگم مغل نہیں تھی۔ ماہم بیگم ٹرانس آکسیانہ اور حصار کے معرکوں میں بابر کے ساتھ رہی[4]۔

بابر کی بیگمات کے نام اس طرح ہمایوں نامہ میں تحریر ہے:

۱۔ **آئشہ سلطان بیگم**:۔ یہ بابر کے چچا سلطان احمد کی دختر تھی اور ۱۵۰۰ء میں شادی ہوئی ایک سال بعد اس کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جو ایک مہینے بعد مرگئی۔ (ہمایوں نامہ)

۲۔ **زینب سلطان بیگم**:۔ سلطان احمد مرزا (بابر کے چچا) کی بیٹی اور آئشہ سلطان بیگم کی ہمشیرہ تھی ۱۵۰۶ء میں شادی ہوئی مگر بدقسمتی سے دو سال بعد انتقال ہوگیا۔ (بابرنامہ)

۳۔ **معصومہ سلطان بیگم**:۔ یہ سلطان احمد مرزا بابر کے چچا تھا۔ پانچویں دختر تھی ۱۵۰۷ء میں شادی ہوئی اور دو سال بعد بیٹے کی پیدائش میں وفات پائی اس کی ایک بیٹی کا نام بھی معصومہ سلطان رکھ دیا۔" (گلبدن ہمایوں نامہ۔ ص ۲۶۳ - ۵ و)

۴۔ **ماہم بیگم**:۔ بیگم کے یہاں پانچ اولادیں ہوئیں:۔ (۱) باربول مرزا (۲) مہرجہاں

---

[1] انسائیکلو میڈیا آف اسلام ج اول ص ۷۱۹

[2] گلبدن بیگم ہمایوں نامہ بیورج ص ۲۵۶

[3] بابرنامہ بیورج ص ۲۴۲۔

[4] ہمایوں نامہ ص ۹۱ بابرنامہ ص ۳۵۸

(۳) احسانی دولت بیگم (۴) فاروق مرزا (۵) ہمایوں مرزا، فاروق کی موت کے بعد بیگم پر بادل ٹوٹ پڑے ماہم بیگم نے گلبدن کو اپنی بیٹی بنا لیا۔

۵۔ **گل رُخ بیگم** :- اس کے خاندان کے بارے میں مورخین خاموش ہیں اتنا ضرور کہا جاتا ہے کہ گل رُخ کی شادی ۱۵۰۸ء میں ہوئی۔ اس کے پانچ بیٹے پیدا ہوئے اور کامران اور عسکری ہمایوں کے لیے سردرد بنے۔

۶۔ **دلدار آغاچہ** :- یہ زینب بیگم کی بہن تھی زینب بیگم جو بابر کی بیوی جس کا انتقال ہوگیا تھا۔ ۱۵۰۹ء میں شادی ہوتی۔ اس کی یہاں پانچ اولادیں پیدا ہوئیں۔(۱) گل بدن بیگم (۲) گل چہرہ بیگم (۳) مرزا ہندال (۴) گلبدن (۵) الور۔ (ہمایوں نامہ ص۲۲۶-۲۲۵)

۷۔ **مبارکہ بی بی** :- یہ شاہ یوسف زئی کی بیٹی تھی۔ ۳ جنوری ۱۵۱۹ء میں شادی ہوئی اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ (بحوالہ ہمایوں نامہ اور اکبر نامہ)

۸۔ **گلنار آغاچہ : نارگل آغاچہ** :- یہ دونوں گلبدن بیگم کے ساتھ خانہ کعبہ بھی گیئں اور زندگی کے آخری ایام میں بابر کو ان دونوں سے زیادہ محبت ہوگئی۔ گلنار بیگم ہندال کی شادی میں شریک تھیں۔

تاریخ شاہ رُخ کے مصنف نیاز محمد کھکنڈی نے بابر کی دسویں بیوی کا نام سیدہ آفاق تحریر کیا ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ ماہم بیگم تیموری خاندان کی چشم چراغ تو نہ تھی مگر یہ ضرور ہے کہ بیگم اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور تیموری خاندان سے رشتہ داری کا بھی تعلق تھا اسی لیے مغل شہزادیوں کے ساتھ ماہم بیگم کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ ماہم بیگم علم و ادب سے بے حد ذوق رکھتی تھیں اسی لیے انھوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے دہلی میں خیر المنازل کے نام سے ایک مدرسہ قایم کیا اس مدرسہ کی عمارت اب منہدم ہوگئی ہے۔ یہ مدرسہ پرانے قلعہ کے پاس واقع ہے اس مدرسہ کا ذکر سر سید احمد نے بھی آثار الصنادید میں کیا ہے۔ آثار الصنادید میں مسجد کے کتبہ کی عبارت اس طرح نقل کی ہے۔

لہ آثار الصنادید باب اوّل ص ۲۷

بدورانی جلال الدین محمد اکبر — کہ باشد اکبر شاہانِ عادل
چو ماہم بیگم عصمت پناہی — بنا کرد ایں بنا مہر افاضل
ولے شد ساعی ایں بقعۂ خیر — شہاب الدین احمد خاں کاڈل
زہے خیریت اس بقعۂ خیر — کہ شد تاریخ او خیر المنازل

بیگم نے اس مدرسے کے ساتھ طلباء کے لیے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی اس مسجد کی خوبصورتی کے بارے میں ایک انگریز ماہر آثارِ قدیمہ تحریر کرتا ہے :

"مسجد پانی سے گھسے ہوئے نوکدار پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ جہاں نقش و نگارش وہیں سُرخ پتھر اور گرانیٹ لگائے گئے ہیں۔ پھاٹک گو اب مسمار ہو چکا ہے بہت ہی خوبصورت ہے مسجد کا اندرونی حصہ رنگین ہے پلاسٹر اور چمکدار اینٹوں سے مزین ہے عمارت کا رخ اور پھاٹک رنگین سفید اور تراشے ہوئے پتھروں کے پھولوں سے منقش ہیں ان میں رنگ نیلے زرد سُرخ ارغوانی سفید اور سیاہ استعمال کیے گئے ہیں اس مسجد میں صرف ایک گنبد ہے جس کی گردن نیچی ہے اس کا کنگورہ بہت ہی عجیب وغریب ہے جو "مسجد قلعہ کونہ" کے کنگورے سے مشابہ ہے۔ مسجد کی دیواریں عمودی ہیں لیکن منارے ڈھلوان ہیں موتی مسجد کی طرح چھجے سامنے نکلے ہوئے ہیں اس میں حجرے ہیں جو اور مسجدوں میں نہیں دیکھے گئے ہیں"[1]

یہ مسجد ماہم بیگم کی دینی تعلیم کی دلچسپی کی آئینہ دار ہے۔ ماہم بیگم نے یہ مسجد طلباء کے لیے بڑی فیاض دلی سے بنوائی جو طلباء کے حصولِ تعلیم کی مرکز بنی یہ مسجد اس بات کی بھی مثال ہے کہ مغل خواتین اس دور میں علم کے فروغ کے لیے ایک خاص جذبہ رکھتی تھیں اور بذاتِ خود بھی تعلیم و تربیت سے آراستہ تھیں۔

ماہم بیگم کے بطن سے مرزا فاروق تھا اس کی موت کے غم کو بھلانے کے لیے گلبدن بیگم کو بیٹی بنالیا اور اسے اپنے محل میں لے گئیں گلبدن نے بیگم کے پاس ہی پرورش پائی۔ ماہم بیگم کی

---

[1] ۔ آرکیالوجی آف دہلی مولفہ سی اسٹیفن بحوالہ پروموشن آف ایجوکیشن ان مغل رول مرتبہ ان لاہوریٹ۱۶

کی موت کے بعد گلبدن بیگم اور ہمایوں دونوں کو بیگم کی یاد تڑپاتی رہی اس کی وفات کے واقع کو گلبدن بیگم یوں بیان کرتی ہیں:

"ماہ شوال کے آغاز میں میری والدہ کے پیٹ میں کچھ تکلیف پیدا ہوئی ۱۳ ماہ مذکور سنہ ۹۴۰ھ اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں اور اس کے فرزند دلبند حضرت ہمایوں کا داغ یتیمی تازہ ہوگیا۔ میرا حال نہایت پریشان تھا۔ مرحومہ نے مجھے پالا تھا، میرے دل میں ہوکیں اُٹھتی تھیں۔ اس سخت صدمے کی وجہ سے میرے حواس بجانہ رہے میں دن رات روتی تھی بادشاہ سلامت کئی مرتبہ میرے پاس آتے، مجھے ہر دم دلاسا دلاتے میری عمر دو سال تھی اور میری پرورش کی میں دس سال کی ہوئی تو وہ اس دار فانی سے رخصت ہوگئیں میں ایک برس تک اپنی والدہ مرحومہ کے محل میں مقیم رہی اور جس وقت ہمایوں بادشاہ دھولپور کو گئے میں گیارہویں سال کے آغاز میں اپنی حقیقی والدہ کے پاس چلی گئی۔" (ہمایوں نامہ صد ۳۰)

حمیدہ بانو بیگم (مریم مکانی)

جام کا علاقہ جو ایران کی سرزمین پر واقع ہے علم و ادب کا گہوارہ ۔ مانا جاتا ہے اور سیاسی اعتبار سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ ہمیشہ سے دانشوروں ادیبوں اور شاعروں کی سرزمین رہی ہے ۔ مولانا جامیؔ اور ہاتفیؔ جیسے عظیم شاعروں کا بھی اسی سرزمین سے رشتہ تھا ۔ حضرت احمد جام ژندہ پیل جیسا صوفی سرمست اور زبردست شاعر بھی اسی سرزمین سے تعلق رکھتا تھا ۔

حمیدہ بانو بیگم کا مغل شہزادیوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھا گیا ہے کیوں کہ حمیدہ بانو بیگم شیخ علی اکبر کی دختر بلند اختر تھی ۔ شیخ علی اکبر کے والد کا نام شیخ احمد جام تھا ۔ شیخ علی اکبر کو بابر کے دربار سے میر بابا دوست کا لقب مل چکا تھا اور بابر نے حمیدہ بانو سے اپنے رشتہ دار ہونے کا اقرار کیا ہے جس کا اعتراف گلبدن بیگم نے ہمایوں نامے میں بھی کیا ہے ۔

حمیدہ بانو بیگم کی زندگی کے ابتدائی حالات اور اس کی ولادت کے بارے میں مورخین خاموش ہیں ۔ اتنا کہا جاتا ہے کہ شادی کے وقت حمیدہ بانو بیگم کی عمر ۱۴ سال تھی اور شادی ۹۴۸ھ میں ہوئی تو اس حساب کے مطابق بیگم کی پیدائش ۹۳۴ھ قرار دیا گیا ہے ۔ حمیدہ بانو بیگم کی شادی کے بارے میں گلبدن بیگم نے ایک نہایت پُر لطف واقعہ بیان کیا ہے ۔

شیر شاہ ۹۴۷ھ میں جب ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان پر قابض ہو گیا ۔ ہمایوں کی بے وفائی غیروں کی غداری قسمت کی بدنصیبی ہمایوں کی سب امیدیں خاک میں مل گئیں تو اسے اپنی لغزشوں کا رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اسے اپنی غفلت شعاریوں و تساہل انگاریوں کا احساس ہو رہا تھا ۔ چاروں طرف یاس کے بادلوں میں گھرا ہوا عالم خواب میں اسے ایک عجیب و غریب منظر آیا ۔ جس کا تذکرہ گلبدن بیگم ہی کے الفاظ میں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے :

"آپ نہایت رنجیدہ و غمگین تھے بستر پر تشریف لے گئے آنکھ لگ گئی خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ تشریف لائے سر سے پاؤں تک سبز لباس پہنے ہاتھ

میں عصا لیے ہوئے تھے فرمانے لگے "غم نہ کھا مردوں کی طرح ہمت بلند رکھ اپنا عصا حضرت (ہمایوں) کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا کہ خدا تجھے ایک فرزند عطا فرمائے گا۔ اس کا نام جلال الدین اکبر رکھنا۔ حضرت ہمایوں نے پوچھا جناب کا اسم مبارک؟ فرمایا میرا نام احمد جام ژندہ پیل ہے اور وہ فرزند میری نسل سے ہو گا۔"

میر بابا دوست مرزا ہندال کے استاد بھی تھے اور حمیدہ بانو بیگم کے والد تھے۔ مرزا ہندال کی والدہ کا نام دلدار بیگم تھا۔ خواب کے واقعہ کے بعد اب ہمایوں کا ستارہ کچھ روشن نظر آنے لگا۔

لاہور سے روانہ ہو کر ہمایوں جب بھکر پہنچا تو دلدار بیگم نے ہمایوں کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا اور یہاں ہمایوں کے خیر خواہ بھی جمع ہوئے اسی دعوت میں ہمایوں نے حمیدہ بانو کو پہلی بار دیکھا تھا مگر اس کا رشتہ ہو چکا تھا، دلدار بیگم سے ہمایوں نے حمیدہ بانو سے نکاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ جس پر مرزا ہندال ہمایوں سے خفا ہو گئے۔ دونوں بھائیوں میں ناچاقی ہو گئی مگر دلدار بیگم نے دونوں بھائیوں کی ناچاقی دور کرا کر حمیدہ بانو کی شادی ہمایوں سے کرادی۔ اور حرم میں آنے کے بعد حمیدہ بانو کو مریم مکانی کا لقب عطا کیا گیا۔

گلبدن بیگم تحریر کرتی ہیں کہ اس زمانے میں عورتیں نامحرم سے پردہ کرتی تھیں اس بات سے اس زمانے کا پردہ شکن گروہ مایوس ہو جاتا ہے اس زمانے میں عورتیں نقاب اور برقع کے بغیر باہر نہیں جاتی تھیں ہمایوں نے نکاح سے پہلے جب حمیدہ بانو بیگم کو بلایا تو اس نے جواب میں کہا کہ آداب سلطنت کے لحاظ سے ایک دفعہ میں بادشاہ کے سلام جا چکی ہوں دوبارہ جانا محرم کے سامنے جانا ہے چنانچہ حمیدہ بانو بیگم کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

دیدن بادشاہان یک مرتبہ جائز است۔ دو مرتبہ دیگر نامحرم است می آیم

گلبدن بیگم نے حمیدہ بانو بیگم کے ذریعہ اس زمانے کی تمدنی، معاشرتی اور خانگی زندگی کی سچی تصویر ہی نہیں بلکہ واقع نگاری کی ایک خوبصورت مثال بھی پیش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ پہلے تو حمیدہ بانو بہت ہی مشکل سے شادی کے لیے راضی ہوتی ہے۔ بقول حمیدہ بانو بیگم "جب شاہ بیگم نے حمیدہ بانو

سے کہا کہ آخر کس کے پلّے تو بندھے گی تو کہتی ہے کہ ہاں اس سے بندھوں گی جس کے گریبان تک میرے ہاتھ پہنچیں نہ اس سے کہ مرا ہاتھ اس کے دامن تک بھی نہ پہنچے ۔‘‘

بزرگ کی پیش گوئی کے مطابق ہمایوں کے یہاں فرزند کی ولادت ۴ رجب ۹۴۹ھ امرکوٹ میں حمیدہ بانو بیگم کے بطن سے ہوئی اور نام جلال الدین محمد اکبر ہی رکھا۔ ہمایوں کی ہمشیر شہزادی سلطانہ حمیدہ بانو بیگم کے اخلاق سے بے حد متاثر تھی اکبر کی پیدائش کے بعد ہمایوں کو کامیابی ملتی دکھائی دینے لگی اور آخر ہندوستان پر ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۵۴۴ء میں حمیدہ بانو بیگم کے ایک لڑکی پیدا ہوئی اس کے بعد ہمایوں نے ماہ کو چک سے شادی کی مگر حرم کے سارے انتظامات حمیدہ بیگم کے ہاتھ میں رہے۔ ۱۵۴۱ء میں حمیدہ بانو نے اکبر کے ساتھ گل بہار کی سیر کی اور ۱۵۵۵ء کو بیگم کابل سے ہندوستان آگئیں ۔

حمیدہ بانو بیگم میں سیاسی شعور بھی تھا۔ اپنی صلاحیت اور تجربہ کی بنا پر بیگم نے بیرم خاں کے بڑھتے ہوئے اثر کو بھی روک دیا اور اکبر اور شہزادہ سلیم کے درمیان اختلاف کو بھی سلیمہ سلطان اور حمیدہ بانو بیگم نے ہی ختم کرایا۔ ۱۰۱۲ھ میں حمیدہ بانو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں اکبر نے والدہ کی موت کے سوگ میں ماتمی لباس پہنا اور اکبر کی تقلید اس کے امراء نے بھی کی اکبر اور دیگر امراء نے حمیدہ بانو بیگم کی میت کو کاندھا دیا اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن کیا۔ جہاں ۱۷۵ شاہی قبریں ہیں جن میں فرخ سیر، داراشکوہ، اعظم شاہ، جہاندار شاہ اور عالمگیر ثانی کی قبریں شامل ہیں ۔

ہمایوں کا مقبرہ دہلی میں واقع ہے۔ جو عرب سرائے سے ملحق ہے یہ بہت ہی کشادہ بنائی گئی ہے۔ بیگم کے ساتھ چند عرب حجازِ مقدس سے ہندوستان آئے اور انھیں کے اعزاز میں یہ سرائے بنوائی گئی تھی ۔

حمیدہ بانو بیگم غریب پرور اور مسکین نواز خاتون تھی وہ بے کس و لاچار انسانوں پر ہی نہیں بلکہ جانوروں اور حیوانوں پر بھی رحم کرتی تھی۔ وہ فرما برداربیوی اور مہربان ماں تھی وہ بہت ہی دین دار پرہیز گار سخی دل، غیور طبیعت، لحاظ دار مزاج کی خاتون تھی۔ تعلیم و تربیت، قابلیت اور

صلاحیت کی حمیدہ بانو بیگم بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ اکبر کی پہلے دور کی زندگی میں جو مذہبی جوش و خروش اور سرگرمی نظر آتی ہے وہ اس کی والدہ حمیدہ بانو بیگم کی تعلیم و تربیت کا ہی اثر تھا کہ اکبر شیخ عبدالسلام اور شیخ عبدالغنی کے گھر پر خود پہنچ کر درس حدیث میں شامل ہوتا ہے اور مسجد میں اکبر خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیا کرتا تھا، پنڈتوں سے بحث و مباحثہ کرنا اور بدعتیوں کو عبرت ناک سزائیں دیتا تھا۔

ایک بار سالگرہ کے موقع پر اکبر نے اپنے کپڑوں میں زعفرانی رنگ چھڑکا اور اسی حالت میں دربار میں چلا آیا شیخ عبدالغنی نے جب یہ نقشہ دیکھا تو وہ مارے غصّہ کے آپے سے باہر ہو گئے وہ لکڑی لے کر اکبر پر جھپٹے اور بھرے دربار میں اسے لکڑی سے پیٹا، اکبر اس وقت تو شیخ کے تقدس اور مذہبی احترام کی بنا پر خاموش رہا مگر —— دربار کے بعد —— والدہ مریم مکانی نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بیٹا نجاتِ اُخروی اسی میں ہے کیا یہ تمہارے لیے باعثِ فخر و مُبارک بات نہیں کہ قیامت تک تمام دنیا میں یہ چرچہ رہے گا کہ ایک مفلوک الحال درویش نے بھرے دربار میں شہنشاہ عالی وقار کے ساتھ ناقابلِ برداشت سلوک روا رکھا مگر اس نے نہایت صبر و ضبط سے کام لیا۔ یہ تھی مریم مکانی، شہنشاہِ وقت کی بیگم کی تعلیم و تربیت جو سب کچھ ہوتے ہوئے بیٹے کو نصیحت کرتی ہیں اور ایک بزرگ کی ہدایت کا احترام اس انداز سے کیا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں مثال نہیں مل سکتی، آج ہماری بیٹیاں اور بیٹے اور اعلیٰ مراتب رکھنے والے مریم مکانی کی تعلیم اور نصیحت سے فیض اُٹھا سکتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی ہدایت پر چل کر مقصدِ حیات پا سکتے ہیں۔

مریم الزمانی

اکبر اعظم کی مریم الزمانی سے شادی قرونِ وسطیٰ میں بہت مفید ثابت ہوئی۔

مولانا محمد علم الدین اپنی معروف تصنیف میں یوں تحریر کرتے ہیں کہ:

"اکبر اعظم کی مریم الزمانی سے شادی نے ایک طرف تو سلطنتِ تیموریہ کی پاسبانی کے لیے راجپوتوں کی ایک جماعت عظیم پیدا کردی اور دوسری طرف ہندوستان کی سیاست کی رو کو یک قلم بدل کر اصلی ہندوستانی قومیت کی بنیاد رکھ دی اور ایسی بنیاد جس پر ہندو مسلم اتحاد کی مستحکم عمارت تعمیر ہوئی' یہ اسی عمارت کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلم ہندوستان کی دو آنکھیں بن گئے۔ اور سگے بھائیوں کی طرح رہنے سہنے لگے۔ مذہبی تنازعات اور معاشرتی فسادات مٹ گئے کوہِ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک اور دریائے سندھ سے لے کر بنگال کے پرے سرے تک ایک تمدن اور ایک معاشرت کا جلوہ نظر آنے لگا[1]۔"

تمام مورخین اس بات کو مانتے ہیں کہ مریم الزمانی اکبر کی حرم محترم تھی۔ مگر طبقاتِ اکبری' اکبر نامہ' تاریخ الفی اور منتخب اللباب کے مصنفین اس کے نام کے لیے خاموش ہیں صرف جہانگیر لکھتا ہے کہ "مریم الزمانی اس کی والدہ مکرمی تھی"۔ مسٹر بیورج نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ مریم الزمانی سلیمہ سلطان کا ہی خطاب تھا[2]۔ مگر بیورج کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔

---

[1] دخترانِ ہند صہ ۷۵

[2] ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۹۰۶

تاریخ آگرہ کے فاضل مصنف خان بہادر سید عبدالطیف نے تین مختلف مقام پر تین خواتین کو مریم الزمانی کے لقب سے خطاب کیا ہے ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ :

"جودھا بائی یا شہزادی جودھ پور اکبر کی ملکہ اور جہانگیر کی والدہ تھی۔
وہ راجہ مالدیو رائے جودھ پور کی دختر بلند اختر تھی جس طرح اکبر کی والدہ مکرمہ کا خطاب مریم مکانی تھا اس طرح جہانگیر کی والدہ کا خطاب مریم الزمانی تھا"

دوسرے مقام پر یوں تحریر کرتے ہیں کہ :

"مریم الزمانی ایک پرتگالی خاتون تھی جو اکبر کی ایک بیوی تھی"

تیسرے مقام پر بیان کرتے ہیں کہ :

"عمارت کے ہندو وضع قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکبر کی ہندو ملکہ یعنی دختر راجہ بہا ری مل المقلب بہ مریم الزمانی کا محل ہے"[1]

مگر مختلف تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ مریم الزمانی نہ تو جودھا بائی تھی نہ راجہ مال دیو کی دختر نہ پرتگالی خاتون نہ سلیمہ سلطان لقب تھا۔ بلکہ حقیقت میں وہ راجہ بہارمل والئی (جے پور) کی لڑکی تھی اور یہ ہی ہندوستان کی تاریخ میں اکبر کی شادی کے بعد مریم الزمانی کے نام سے مشہور ہوئی اور اکبر نے خوش ہو کر اسے شاہ بیگم کا خطاب عطا کیا۔

۹۶۹ھ میں یہ شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے بعد مریم الزمانی نے اپنے آپ کو تیموری تہذیب و تمدن میں ڈھال لیا اور مسلم اصولوں کے پابند ہو گئی۔ زندگی کے آخری ایام میں تو وہ سچی پکی مسلمان ہو گئی تھی۔

۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ بروز چہارشنبہ بادشاہ بیگم کے بطن سے فرزند پیدا

---

[1] تاریخ آگرہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۶ء صہ ۱۹۳

ہوا، جس کا نام شیخ سلیم چشتی کے نام پر سلیم رکھا اکبر اسے شیخو کے نام سے پکارتا تھا شہزادہ کی پیدائش کے بارے میں بھی مورخین کی الگ الگ رائے ہیں۔ تزک جہانگیر کے صفحہ نمبر ۲-۲ پر طبقات اکبری کے صفحہ نمبر ۲۸۷ پر خفی خاں کی تصنیف صفحہ نمبر ۱۷۴ پر خلاصتہ التواریخ کے ورق نمبر ۳۴۱ پر اور تاریخ فرشتہ میں شہزادہ کی تاریخ ولادت ۹۷۸ھ میں تحریر ہے۔ یہ تاریخیں بالکل غلط ہیں شہزادہ کی تاریخ پیدائش ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ بروز چہار شنبہ صحیح ہے۔

مریم الزمانی ۹۸۶ھ میں آگرہ سے دہلی آیئں ۹۹۲ھ میں اس نے شہزادہ سلیم کی شادی بھگوان داس کی دختر سے کرائی ۱۰۱۴ھ میں اکبر کے انتقال کے بعد مریم الزمانی کی زندگی کا چین و آرام ختم ہوگیا۔ بیگم کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اکبر کے ساتھ شکار کو جایا کرتی تھی بیگم نے اپنے ہی خرچے سے 'برہ' مقام پر ایک باغ اعلیٰ سرائے اور نفیس باولی تعمیر کرائی۔

بیگم صاحبہ نے ۱۹ رجب ۱۰۳۲ھ کو اس داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ خبر جہانگیر کو اجمیر میں ملی۔ بیگم کا مقبرہ سکندرہ میں سلطان سکندر لودی کی بارہ دری میں واقع ہے۔

بیگم بہت ہی پاکیزہ خصلت، انصاف پسند، مخلص طبیعت، خلیق، بامروت سلیقہ شعار اور حسن ظاہری سے آراستہ تھی وہ نظام سلطنت اور سیاسی بصیرت کا شعور رکھتی تھی، وہ نہایت مخیر سخی تھی۔ بیگم نے لاہور میں بھی ایک مسجد تعمیر کرائی جو بیگم مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

جودھ بائی

جودہ بائی کے لفظی معنی جودھ معنی، جودھ پور اور بائی معنی لڑکی یعنی جودھ پور کی لڑکی یہ نقطہ بر جودھ پور کی لڑکی کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ جیسے لکھنوی، دہلوی وغیرہ۔

تمام مورخین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ جودھ بائی جہانگیر کی رانی تھی اور خرّم اسی کے بطن سے پیدا تھا۔ جودہ بائی تاریخ جگت گوسائیں کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ خرّم کی والدہ "جگت گوسائیں"، کی تصدیق تزکِ جہانگیری سے ہوتی ہے ———— مگر جہانگیر نے خرم کی پیدائش کی جو تاریخ ۹۹۹ھ میں تحریر کی ہے اس سے عملِ صالح، خفی خاں اور ہسٹری آف لاہور کے موئف خان بہادر سید محمد لطیف اتفاق نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ خرم ۳۰ ربیع الاوّل ۱۰۰۰ھ کو جگت گوسائیں کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور خرم کی پرورش رقیہ بیگم جو اولاد کی دولت سے محروم تھی اس کے سپرد کی گئی ـ (بحوالہ دُختران ہند، از مولانا محمد علیم الدین صفحہ ۹۶)

شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد خرّم کی والدہ عظمت کے وقار میں بھی اضافہ ہوا، اور شہزادہ خرّم کی ترقی بھی والدہ کے ہی دم سے وابستہ تھی۔ جگت گوسائیں نے ہی خرّم کی شادی مظفر حسین خاں کی دُختر بیگم صاحب سے ۱۰۱۸ھ میں کرائی گوسائیں جہانگیر کے ساتھ نورجہاں کی طرح جایا کرتی تھی۔

"شکار کے ایک واقع کو خفی خاں یوں تحریر کرتے ہیں کہ "ایک دفعہ شیر کے شکار کے دوران جب شیر غرّاتا ہوا جہانگیر کی طرف بڑھا تو شیر کو غصہ میں دیکھ کر نورجہاں سہم گئی مگر رانی کو گوسائیں نے بندوق اُٹھائی اور نشانہ باندھ کر گولی چلادی، گولی شیر کے سینے میں اتر گئی۔۔۔۔ شیر کو مردہ اور رانی کو تفنگ بردوش دیکھ کر جہانگیر بہت خوش ہوا"۔ یہ بیان بھی سُنا گیا ہے کہ گولی نورجہاں نے چلائی تھی۔

جودہ بائی راجہ اودے سنگھ سین والئے جودھپور کی دُختر تھی وہ نازک اندام پری تمثال

حسنِ مجسّمہ تھی وہ شجاع و بہادر بھی تھی۔ فنونِ جنگ میں ماہر تھی وہ سخی طبیعت اور سلیقہ شعار خاتون تھی لطیفہ گوئی میں خاص دلچسپی رکھتی تھی۔ ایک بار جہانگیر سے نور جہاں نے کہا کہ حضور منہ سے بو آئی ہے بادشاہ نے مہارانی کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کیا یہ سچ ہے اس پر مہارانی نے فوراً جواب دیا جس عورت نے صرف ایک ہی مرد کا منہ سونگھا ہو وہ خوشبو اور بدبو میں کیا تمیز کر سکتی ہے۔ نور جہاں یہ جواب سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئی مہارانی کے جواب سے خوش ہو کر جہانگیر نے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر مہارانی کو بخش دیا۔

اس سلسلہ میں مخدّراتِ تیموریہ کا مندرجہ ذیل لطیفہ بھی بہت دلچسپ ہے :

"ایک دن نور جہاں کو شرارت سوجھی اور اس نے جودہ بائی کو نیچا دکھانے کی غرض سے بادشاہ سے کہا کہ جودہ بائی رسوئی خوب پکاتی ہے بادشاہ نے فوراً ارشاد کیا کہ جودہ بائی آج تم اپنے طریقہ سے رسوئی کا انتظام کرو اور اپنے ہی ہاتھ سے پکاؤ تو ہم کھائیں جودہ بائی نے عرض کیا کہ بہت اچھا یہ کہہ کر رسوئی تیار کی گئی لیکن کھانے سے بیشتر نمک مرچ کا ذائقہ چکھ لیا نور جہاں جو اس موقع کی منتظر تھی بے ساختہ بول اٹھی کہ بادشاہ سلامت مہارانی نے تو رسوئی جھوٹی کر دی۔ جودہ بائی نے نہایت دلیری سے جواب دیا کہ جب شوہر کو جھوٹی ہی چیز پسند ہے تو میں کیا کروں جہانگیر اس لطیفہ سے بہت خوش ہوا اور نور جہاں عرق ندامت میں غرق ہو گئی [1]

جودھ بائی میں خصائل حمیدہ کی کوئی کمی نہ تھی وہ غریب پرور لاچار و مجبوروں کی ہمدرد تھی اس کا خوانِ کرم ہندو اور مسلم دونوں کے لیے کشادہ تھا۔ مہارانی نے ۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۲۸ھ میں وفات پائی اور نور منزل کے قریب باغ دہرہ میں دفن کیا گیا۔ مرنے کے بعد بیگم کو بلقیس کا لقب دیا گیا۔ ملا محمد صالح کا بیان ہے :

---

[1] بحوالہ دخترانِ ہند صفحہ ۱۰۶/۱۰۵

"تیموریوں میں یہ دستور تھا کہ حرم سرا کی بیگمات کو خاص خطابات عطا کیے جاتے تھے تاکہ ان کا اصلی نام زبان پر خاص و عام نہ ہوسکے اسی لیے اکبر کی والدہ کو مریم مکانی جہانگیر کی والدہ کو مریم زمانی اور شاہجہاں کی والدہ کو بلقیس مکانی کہا جاتا تھا۔"[۱] (عمل صالح صہ۱۱ دختران ہند صہ۱۰۱)

بیگم صاحبہ کا مقبرہ مالپورا اور فتح پور سیکری کے پاس خواجہ سرائے گاؤں کے درمیان بہت ہی بچنتہ بنایا گیا۔ اسی کے پاس چاند ماری کا میدان ہے۔ آگرہ کے قلعہ میں بیگم کا محل جہانگیری محل کے نام سے مشہور ہے یہ محل بیگم کی اصلی یادگار ہے۔

ملکہ زینت محل

نواب زینت محل تو احمد قلی خاں کی چہیتی بیٹی اور بہادر شاہ ظفر کی ملکۂ خاص تھی۔ نواب احمد قلی خاں شاہ درانی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ملکہ زینت محل نے اپنی قابلیت اور صلاحیت سے بادشاہ پر ایسا اثر کیا کہ ملکہ کا سلطنت کے تمام کاموں پر اثر ہوگیا بادشاہ نے حکم جاری کیا جس دستاویز پر نواب زینت محل کی مہر نہ ہوگی وہ غیر معتبر سمجھا جائے گا۔ دہلی میں لال کنویں کے پاس اس کا مکان تھا۔ انگریزوں نے وہ مکان نواب پٹیالہ کو دیدیا۔ ملکہ زینت محل نے آخری وقت تک بادشاہ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور جلاوطنی کے عالم میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

زینت محل

بشکریہ ڈاکٹر عتیق انور صدیقی (انچارج لال قلعہ میوزیم دہلی)

سلیمہ سلطان بیگم

یہ حسینہ ورجہرہ شہنشاہ بابر کی بیٹی گل رخ بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اس کے والد کا نام مرزا نورالدین محمد تھا۔اس طرح بیگم ہمایوں کی بھانجی اور بابر کی نواسی تھی سلیمہ سلطان بیگم کو حسن کی دیوی اور نور کی پتلی کہتے تھے اس کی پہلی شادی بیرخاں کے بیٹے سے ہوئی اور شوہر کی وفات کے بعد بیگم کی شادی اکبر سے ہوئی۔سلیمہ بہت ہی بہادر سخی دل اور عقلمند تعلیم یافتہ خاتون تھی۔

تزک جہانگیری کی بنا پر مولانا محمد حسین آزاد دربارِ اکبری کے صفحہ ۷۳۶ پر تحریر کرتے ہیں کہ سلیمہ سلطان کی شادی صرف پانچ سال کی عمر میں ہوئی۔ مگر حیرت ہوتی ہے جبکہ تیموریہ خاندان کی شہزادیوں کی شادیاں ۱۸، ۲۰ اور ۲۲ سال کی عمر میں ہوتی تھیں۔اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر پر ہندو رانیوں کا اثر تھا۔کیونکہ ہندو بیوہ کی شادی کو معیوب سمجھتے اور ہندو تمدن کے خلاف مانتے ہیں۔شادی کے وقت جب بیرم خاں پورے عالم شباب پر تھا تو غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ صرف پانچ سال کی بچی سے شادی کس طرح کرتا یہ تو واقعات کا منہ چڑھانا ہے۔

۹۶۷ھ میں جب سلیمہ سلطان اپنے شوہر کے ساتھ حج کو جارہی تھی تو راستہ میں بیرم خاں کو ایک افغان نے قتل کر دیا ایک طرف شوہر کے غم میں اشکبار دوسری طرف اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس کے بعد سلیمہ سلطان کی شادی اکبر سے ہوئی اور ۹۸۳ھ میں گلبدن بیگم کے ساتھ حج کو گئیں اور ۳½ برس میں چار بار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئی۔

سلیمہ سلطان کو سیاست میں ملکہ حاصل تھا اکبر اکثر سیاسی اور ملکی نظام میں بیگم سے مشورہ لیا کرتا تھا۔سلیمہ سلطان کی زندگی کے آخری ایام بڑے سکون سے گزرے۔

"سلیمہ سلطان بیگم کی وفات ۱۰۲۱ھ کو ۷۶ برس کی عمر میں ہوئی۔ بیگم نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں ہی باغ منڈا میں تیار کرا لیا تھا۔ چنانچہ اعتماد الدولہ نے نہایت تزک و احتشام سے بیگم کو اسی مقبرہ میں دفن کرایا۔" (تزک جہانگیری ص۱۱۳)

سلیمہ سلطان بیگم حقیقت میں نیک طبیعت خوش مزاج شیریں کلام شیریں بیاں زبان حاضر جواب بذلہ سنج باسلیقہ اور صاحب تدبیر خاتون تھی بیگم کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ وہ حسین سیرت کے ساتھ ساتھ حسین صورت سے بھی مالا مال تھی۔ مختلف علوم و فنون کے علاوہ شاعری میں بھی درک رکھتی تھی۔"

(خفی خاں منتخب اللباب ص۱۷۳)

"بیگم ہر طرح کے اخلاق حسنہ سے آراستہ تھی ایسی قابل ہستیاں عورتوں میں بہت کم پیدا ہوئی ہیں۔ بیگم نے جس طرح اکبر اور شہزادہ سلیم کے درمیاں غلط فہمیاں دور کرائیں اسی طرح بادشاہ جہانگیر کو چار و نا چار بیگم کے سمجھانے پر مرزا کوکلتاش کی خطا بخشنی پڑی، بیگم میں خصائل حمیدہ قدرت نے بہت عطا کیے تھے۔ اس کے ساتھ وہ زیور شاعری سے بھی آراستہ تھی مورخین نے اس کی سخن سنجی اور نکتہ فہمی کی بڑی تعریف کی ہے اور کتب تاریخ میں اس کا یہ مندرجہ ذیل شعر درج ہے: ؎

"کاکلت را من ز مستی رشتۂ گفتہ ام
مست بودم زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام"

زباں کی سلاست بیاں کی ندرت الفاظ کی برجستگی فقروں کی بے ساختگی اور بندش کی چستی نے شعر کو سحر حلال بنا دیا ہے۔ بیگم کا مخفی تخلص تھا۔

منتخب التواریخ اور لب التواریخ کے مصنفین نے سلیمہ سلطان بیگم کے سیاسی شعور اور ذہانت کی تعریف کی ہے۔ جہانگیر خود بھی بیگم صاحبہ کی بڑے خوبصورت انداز میں تعریف کرتا ہے وہ تزک میں تحریر کرتا ہے۔

"یہ جمیع صفات حسنہ آراستگی واشتند" در زنان ایں مقدار
ہنر وقابلیت کم جمع می شود[1]۔"

بیگم بے حد ادبی ذوق رکھتی تھی۔ اپنے عہد کی معروف شاعرہ تھی۔ ماثر الامراء آئین اکبری اور اقبال نامہ جہانگیری کے مورخین نے بیگم کا تخلص مخفی لکھا ہے مگر مخزن الغرائب کے مؤلف نے اس کا تخلص مخلص بیان کیا ہے بیگم کا صرف ایک ہی شعر تذکروں میں نقل کیا ہے، جو بیان کیا جاسکتا ہے۔ بیگم کا ایک ذاتی کتب خانہ تھا۔ جس سے اس کے علمی وادبی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی کتب بینی کے شوق کے لیے یہ کتب خانہ کھولا تھا مخزن الغرائب صفحہ نمبر ۳۶۰ پر فیضی کے مرثیہ پر حسب ذیل رباعی درج ہے۔

فیضی مخور رایں کہ دلت تنگی کرد — با پائے امید عمر لنگی کرد
می خواست کہ مرغ روبنید رخ دوست — زیں واسطہ از قفس شب آہنگی کرد

یہ رباعی کا ملا بیگم کے ذکر میں نقل کی گئی ہے مگر بعض نسخوں میں تحریر ہے کہ یہ رباعی سلیمہ سلطان بیگم کی طرف منسوب ہے۔ (بحوالہ بزم تیموریہ جلد سوم صہ ۲۴)

ماثر الامراء کے مصنف نے سلیمہ سلطان کا نام گلبرگ بیگم لکھا ہے۔ (جلد اول صہ ۳۷۵)

جہانگیر تزک میں لکھا ہے " والدہ ایشاں گل رُخ بیگم منبیہ حضرت فردوس مکانی بودند صہ ۱۱۳، بابرنامہ مرزا نور الدین کی نسبت کے بارے میں خاموش ہے گل بدن نے اس تذکرے کو نظر انداز کر دیا جو ہر آفتابچی بھی مہر بلب ہے۔ اکبر کے عہد کے کسی مورخ نے بھی صاف ذکر نہیں کیا ہے۔ ــــــ ماثر رحیمی کے مصنف ملا عبدالباقی نے سلیمہ سلطان کی والدہ کا نام گل رخ بیگم ہی تحریر کیا ہے۔ سلیمہ سلطان کا شجرہ والدہ کی طرف سے بابر اور والد کی طرف سے خواجگان سے ملتا ہے جو صاحب نسب بزرگ تھے بیگم کی ولادت کے بارے میں قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۵۳۹ء یعنی شوال ۹۴۰ھ کو پیدا ہوئی اس کی

---

[1] تزک صہ ۱۱۴

تعلیم وتربیت کے لیے سلیقہ منداستانیاں مقرر کی گئیں جنھوں نے تمام علوم مروجہ سے طاق کر دیا۔ بہت سی شریف زادیوں نے اسے مذہبی مسائل اور خانہ داری سکھائے فنونِ لطیفہ اسے اپنے نانا بابر سے وراثت میں ملے علم ہیئت، علم ریاضی میں بھی ماہر تھی۔ سلیمہ سلطان بیگم خدیجہ الزمانی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ وہ سلیقہ شعاری اور پاکدامنی کی مجسم تصویر اور مذہبی مسائل کی جیتی جاگتی مورت تھی۔ اس میں حرم تیموریہ خاتون کی سب ہی خوبیاں تھیں۔

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضہ داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کم سنی کے عالم میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تمام نگہداشت اس کی والدہ گل رُخ بیگم نے کی ۱۹ سال کی عمر میں ہمایوں نے بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں سے شادی کی تقریب جالندھر میں بڑی شان سے ادا کی۔ یہ شادی سیاسی مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے کی گئی، جس طرح شیر شاہ سلطنت کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ اسی طرح بیرم خاں سے خطرہ نظر آ رہا تھا۔

ملکہ بانو بیگم

ملکہ بانوں مرزا غیاث (اعتماد الدولہ) کی دختر اور آصف خاں اور نور جہاں کی حقیقی بہن تھی۔ سیاسی وجوہات کی بنا پر جہانگیر نے ملکہ بانو کی شادی سید عبداللہ سیف خاں سے کرادی۔ سید عبداللہ سیف خاں سادات بارہ میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ سید عبداللہ سیف خاں نور جہاں کا حامی اور شہریار کا طرفدار تھا۔ اس بات پر میاں سے ملکہ بانو کا اختلاف تھا۔ لیکن ملکہ بانو نے فرائض زوجیت کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑا اور شوہر کے حکم کو بحُسنِ اخلاق انجام دیتی رہی آج کل کی بیویوں کے لیے ملکہ بانو کی زندگی ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔ ملکہ بانو ہمیشہ اپنے سرتاج کی تعریف کرتی رہتی تھی وہ بخوبی واقف تھی کہ عورت کی عزت شوہر کے ہی دم سے ہوتی ہے۔ خاوند کا گھر عورت کے لیے جنت سے کم نہیں ہوتا" یہ اس وقت کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ افسوس کہ مغرب کی ملمع کاریوں اور مادہ پرستانہ تہذیب کی مکر چاندنی نے ہمارے زیورِ تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کو حسن اخلاق، دین داری اور نیک خصائل سے دور کر دیا ہے۔

گلبدن بیگم، مریم مکانی، نور جہاں ممتاز محل، ملکہ بانو، زیب النساء بیگم وغیرہ خواتین کی زندگی سے ہماری خواتین سبق حاصل کر سکتی ہیں۔ پنجہ بیگم نور جہاں کی سگی بہن تھی جس کے شوہر نواب قاسم اس زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔

۲۸ صفر ۱۰۵۰ھ کو سید عبداللہ سیف خاں کے انتقال کے بعد ملکہ بانو کی خوشی اور عیش و آرام ختم ہو گیا وہ آگرہ سے لاہور چلی گئی۔ بقیہ زندگی عبادت و ریاضت میں گزاری اور ۱۰۵۱ھ میں ملکہ بانو نے وفات پائی۔" جہانگیر خود آصف خاں کے محل تشریف لائے، قرآن خوانی اور فاتحہ کا اہتمام کیا گیا۔ ملکہ بانو کا مقبرہ اعتماد الدولہ کے

مقبرہ میں واقع ہے۔ ملکہ بانو بھی نور جہاں کی طرح حسین و جمیل اور سلیقہ مند خاتون تھی وہ بہت ہی نیک، دین دار شوہر پرست تھی اور شوہر کی اطاعت کو اپنا ایمان سمجھتی تھی۔ ملکہ بانو بھی غریب اور یتیم بیکس و مجبور لڑکیوں کی پرورش کو اپنی ذمہ داری مانتی تھی۔ وہ بہت ہی رحمدل خاتون تھی۔

جاناں بیگم

جانا بیگم بیرم خاں کی بیٹی اور عبدالرحیم خانِ خاناں کی ہمشیر تھی۔ یہ بہت ہی عقلمند اور دانشمند خاتون تھی تعلیم یافتہ خواتین اور استاد شاعرات میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ سخن وری اور طباعی لحاظ سے وہ اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی اس کا مشہور شعر ملاحظہ ہو: ؎

"عاشق ز خلق عشق تو پنہاں چساں کند
پیداست از دو چشم ترش خوں گریستن"

اس شعر سے جو برجستگی اور شیوا بیانی اور شاعرہ کی قدر الکلامی اور زہ دو بیانی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اہلِ ذوق پر مخفی نہیں۔ جانا بیگم کے حسن و جمال کی تمام ہندوستان میں شہرت تھی۔ بیرم خاں کی اکلوتی بیٹی بہت نیک سیرت خاتون تھی وہ فطرتاً علوم دینیہ میں بہت دلچسپی رکھتی تھی اس نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی۔ اس مقدس کام کے صلہ میں اکبر اعظم نے ۵۰ ہزار دینار عطا کیے اور اس تفسیر کو بہت ہی آرزومندی سے اپنے کتب خانہ میں جگہ دی۔

جاناں بیگم کی شادی اکبر کے بیٹے شہزادہ دانیال سے ہوئی۔ جاناں بیگم اپنے حسن و اخلاق اور فیاض دلی کے لیے بہت مشہور تھی وہ فقراء اور مشائخ سے بہت عقیدت رکھتی تھی اور علماء و فضلاء کی بڑی قدر کرتی تھی۔ اس کی شادی بہت ہی سادہ طریقہ سے ہوئی، اس نے خود فضول رسومات کو ختم کر دیا۔ پھر بھی بیرم خاں کی

جانا بیگم

اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے شادی میں دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ شہزادہ دانیال کے انتقال کے بعد جب نورالدین محمد جہانگیر تخت نشین ہوا تو جہانگیر نے جانان بیگم سے نکاح کا پیغام بھیجا۔ اس وفا شعار و عفت مآب خاتون نے اس کے جواب میں اپنے پورے دانت نکلوا کر اور زلفیں ترشوا کر جہاں گیر کی خدمت میں پیش کیا۔ جہاں گیر عفّت و حیا کا یہ نمونہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور جانان بیگم سے پھر کبھی نکاح کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

زندگی کے آخری دنوں میں جانان بیگم حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئیں آخر ۱۰۷۰ھ میں وفات پائی اور اپنے پسماندگان سے ہمیشہ کے لیے مفارقت کر کے جدائی کا دردناک داغ دے گئی۔

جانان بیگم کے کلام کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو؟

خیز تا رہ برہ گذار کنیم — خویش را چشم انتظار کنیم

زراہ امن و سلامت کے بادبرسد — غبار تا نشود خاک پا با دنرسد

(بحوالہ بزم تیموریہ جلد سوم صہ ۲۲۳، مرأۃ العالم صہ ۳۷۵)

ستی النساء

"پہلو نشین تاج"

ایران کے معروف علاقہ مازندران کے شہر آمل جو شہرِ آفاق یعنی بلبلوں کے شہر کے نام سے مشہور ہے ستی النساء اسی شہر کی رہنے والی تھی ستی النساء کا خاندان اپنی قابلیت اور علمیت میں بے حد شہرت رکھتا تھا۔ طالب آملی ان کا چھوٹا بھائی دربارِ جہانگیری سے تعلق رکھتا تھا۔ ستی النساء کی شادی حکیم نصیرائے کاشی سے ہوئی۔ رکنائے کاشی۔ اپنے دور کے زبردست عالم فاضل اور مشہور شاعر تھے۔ دونوں بھائی اپنی ہمشیر ستی النساء کو دل و جان سے پیار کرتے تھے۔

ستی النساء اپنے بھائیوں کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھی ایک بار ستی النساء اپنے بھائی سے ملنے آگرہ بھی آئیں ۱۶۲۶ء میں طالب کے انتقال کے بعد ستی النساء پریشانیوں میں گھر گئی۔
"حوادث کی ان صبر آزماں اور حوصلہ شکن تیز و تند آندھیوں سے اس کا عیش و آرام بالکل منغض ہو گیا"

اب ستی النساء نے وطن سے ممتاز محل کے آستانِ فلک نشاں کا رُخ کیا بیگم اس کی لیاقت سے متاثر ہوئی اور ستی النساء کو محل میں ملازمت مل گئی، ستی النساء تعلیم و تربیت سے آراستہ تھی۔ قرآن پاک کی حافظ تھی۔ امورِ خانہ داری میں بھی مہارت رکھتی تھی۔ علم طب سے بخوبی واقف تھی۔ ممتاز محل اس کی دین داری و دیانتداری، سلیقہ شعاری، خوش اسلوبی، فرائضِ منصبی سے بہت خوش تھی اسی لیے ستی النساء کو مہرداری، شاہی محل کے اہم کاموں اور جہاں آرا کی تعلیم و تربیت کو بھی سپرد کر دیا۔ اور ستی النساء ان کاموں کو بخوبی انجام دیتی رہی۔

بدنصیبی اس بات کی تھی کہ ستی النساء کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ طالب آملی کی دونوں بچیوں کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی۔ تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے ایک کی شادی عاقل خاں اور دوسری

حکیم ضیاء الدین سے کر دی ۔

۱۶۴۷ء میں ستی النساء کی چھوٹی بھتیجی کی اچانک موت سے اس پر غم کے بادل ٹوٹ پڑے اسی دوران گلے کے درد سے دل کی حرکت بند ہوگئی اور ستی النساء بیگم اس دنیا سے ہمیشہ کو رخصت ہو گئی۔ ستی النساء کا روضہ تاج محل کے مغرب کی جانب جلوخانہ کے متصل ہے جو تاج گنج کا علاقہ کہلاتا ہے ۔

عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ :

"ستی النساء خانم اپنی کاروائی، شیوہ بیانی، شناسائی آدابِ بندگی ورسومِ خانہ داری اور فنِ طب میں مہارت رکھنے کی وجہ سے ملکہ ممتاز الزمانی کی منفربِ خاص تھی، وہ علمِ قرآن سے اچھی طرح واقف تھی۔ قرآنِ کریم نہایت ترتیل سے پڑھا کرتی تھی اور فارسی نظم ونثر پر پوری طرح قادر تھی"۔ (شاہجہاں نامہ جلد دوم ص ۶۲۹)

ستی النساء کی پوری زندگی اس کے کردار اور علمیت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ خانم جیسی خاتون پورے مغل دور میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اس کا تقدسِ حیات دیانتداری قابل فخر ہے اور آج کی عورتوں کے لیے اس کی حیات اور کام سبق آموز ہیں۔

دلرس بانو بیگم :-

دلرس بانو بیگم کے والد شاہ نواز خاں صفوی اپنے عہد کے معروف آدمی تھے ۔ انھوں نے اپنی اس ہونہار خوش نصیب لختِ جگر کو ہر طرح کی تعلیم تربیت سے آراستہ کیا۔ اتنی ماہ پیکر کہ چہرہ پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ دلرس فصاحت و بلاغت میں مثال نہیں رکھتی تھی۔ یہ جنت کی حور غریب پروری اور مسکین نوازی میں کافی مشہور تھی، دلرس بانو بہت ہی بہادر حوصلہ مند اور نسوانی خوبیوں سے بھرپور تھی، انھیں خوبیوں سے متاثر ہو کر اورنگ زیب نے اپنی زوجیت میں لیا۔ دلرس کے بطن سے پانچ اولادیں پیدا ہوئیں۔ دو لڑکے محمد اعظم اور محمد اکبر جو بہت ہی بہادر تھے اور تین بیٹیاں تھیں۔ زیب النساء بیگم، زینت النساء بیگم اور زبدۃ النساء بیگم ۔

بائی بھونت دی

یہ خاتون راجہ کشنو رکی لاڈلی بیٹی اور اورنگ زیب کی بیوی تھی۔ زندگی کے حالات معلوم نہیں اتنا ضرور ہے کہ بیگم بہت ہی شائستہ مہذب اور بااخلاق خاتون تھی یہ بھی معلوم نہیں کہ اورنگ زیب تک اس خاتون کی کس طرح رسائی ہوئی۔

بی بی بائی :-

یہ خاتون شیر شاہ کی بھتیجی اور سلیم شاہ کی بیوی تھی۔ اس کا نام ماہی بائی بھی لکھا ملتا ہے۔ تاریخ فرشتہ اور طبقات اکبری میں صرف بائی لکھا ہے۔ بہرحال یہ خاتون بہت ہی معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ جب اس کے سگے بھائی نے اس کے شوہر اور بیٹے کو قتل کر دیا تو یہ غم میں ڈوب گئی۔ اور روتی روتی ہی اس دنیا سے جُدا ہو گئی۔

رضیۃ النساء بیگم :-

رضیتہ النساء بیگم شہزادہ محمد اکبر کی بیٹی، اورنگ زیب عالمگیر کی پوتی تھی۔ یہ خاتون بھی اپنی سخاوت اور فیاض دلی کے لیے مشہور ہے یہ نیک بندی بہت ہی غریب پرور مزاج تھی۔ زندگی کی عاقبت سدھارنے میں ہمیشہ ہی سادہ زندگی بسر کی ۱۱۱۵ھ میں شوہر کے انتقال کے بعد شہزادی بھی عرصہ بعد اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئی۔

نواب زبدۃ النساء بیگم :-

نواب زبدۃ النساء بیگم زیب النساء کی حقیقی ہمشیر اور اورنگ زیب کی نیک بخت دُختر تھی۔ بیگم دلرس بانو کے بطن سے ۱۰۶۱ھ میں پیدا ہوئی۔ عالمگیر کی اس لختِ جگر کی شادی دارا شکوہ کے بیٹے سپہر شکوہ سے ہوئی تھی۔ نواب زبدۃ النساء بیگم کی شادی سپہر شکوہ سے شاہجہان نے

اورنگ زیب سے بضد ہو کر کرائی تھی۔ والد کے اسرار پر عالمگیر بخوشی رضامند ہو گیا اور اپنی جہیتی بیٹی کا نکاح داراشکوہ کے بیٹے سے کر دیا اور پرانی سب رنجشوں کو بھلا دیا۔

سلیمہ بانو بیگم :

شہزادی سلیمان شکوہ کی بیٹی اور داراشکوہ کی پوتی تھی یہ عصمت مآب عقل و دانش میں شہزادۂ آفاق ثابت ہوئی۔ سلیمہ ایسی نیک سیرت اور حسین صورت شہزادی تھی کہ خاندان کے سب لوگ اس سے پیار کرتے تھے داراشکوہ کو بھی سلیمہ بانو بیگم دل و جان سے عزیز تھی وہ اکثر شہزادی کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ سلیمہ بانو بیگم اپنے والدین کے انتقال کے بعد گوہر آرا بیگم کے پاس رہنے لگی۔ والدین کی محرومی سے سلیمہ بانو بیگم کے لیے یہ دنیا تاریک ہو گئی۔ زندگی کی ہر مسرت نے منہ چھپا لیا۔ دنیا کی ہر نعمت سے محروم زندگی بے لذت نہ کوئی ہنسی نہ خوشی، چاروں طرف بے کیفی اور اداسی نظر آتی تھی۔ دنیا کی ہر لذت اس کی آنکھوں کا کانٹا بن گئی دن رات رو رو کر بسر ہونے لگی۔

غم و یاس میں ڈوبی اس مجسم تصویر کو اورنگ زیب نے ایک دن اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ "تم اس طرح سلیمہ کب تک روتی رہو گی بیٹا! اب تم مجھے اپنے باپ کی جگہ اور گوہر آرا کو اپنی والدہ کو قائم مقام سمجھو اور یقین کرو کہ مجھے تم سے نہ صرف اب بلکہ مرتے دم تک وہی محبت اور تعلق و اتحاد رہے گا۔ جو ایک نہایت شفیق و مہربان اور ناز بردار باپ کو اپنی ہونہار اولاد سے ہوتا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اور انشاءاللہ میں اپنے وعدہ میں سچا ثابت ہوں گا۔ جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے تمھیں کسی طرح بھی زحمت و تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔"[۱]

اس تقریر کا سلیمہ بانو بیگم پر بہت اثر ہوا، اور اورنگ زیب کو بھی بہت صدمہ پہنچا محبت اور جوش میں سکتہ کی کیفیت تاری ہو گئی، زار و قطار روتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے بعد عالمگیر نے سلیمہ بانو بیگم کی شادی اپنے چھوٹے شہزادہ اکبر سے کر دی، یہ شہزادہ بھی دلرس کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔

---

[۱] بیگمات خاندان تیموریہ ص۲۷۔

جانی بیگم :

آنی بیگم اورنگ زیب کے ممتاز جنرل نجابت خاں کی چہیتی بہن تھی اورنگ زیب آنی بیگم کو شہزادیوں کی طرح چاہتا تھا۔ زیب النساء بھی آنی بیگم کی بہت عزت کرتی تھی۔ آنی بیگم ذی علم اور بہت خوبصورت اور نیک سیرت اور خوش مزاج خاتون تھی۔ آنی بیگم نے ۱۰۸۸ھ میں وفات پائی۔

عظمت النساء بیگم :-

یہ امیر تیمور کی تیسری بیوی تھی۔ یہ پری جمال خاتون بنارس کے ایک برہمن کی بیٹی تھی جنگ میں اس کے والد، چچا اور بھائی سب مارے گئے تو عظمت النساء امیر تیمور کی قید میں گرفتار ہوگئی۔ اس کا اصلی نام جینی تھا۔ امیر تیمور جینی کی خوبیوں سے ایسا متاثر ہوا کہ جینی سے شادی کرلی اور عظمت النساء کا خطاب دیا، زندگی اور حالات معلوم نہ ہوسکے۔

اختر زمانی بیگم :-

اختر زمانی بیگم کے دل پر دنیا کے کچھ حادثات نے ایسا اثر کیا کہ وہ دنیاوی امور سے بے نیاز ہوگئی اختر زمانی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں تاریخ خاموش ہے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ علوم و فنون سے آراستہ تھی بہت ہی ذہین اور غریب پرور نیک سیرت خاتون تھی یتیموں کو کھانا کھلانا زندگی کا مقصد بن گیا بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتی تھی، علماء کی بہت قدر کرتی تھی تہجد گزار زاہدہ تھی۔

آرزم بیگم :-

یہ سیادت صفوی کی اکلوتی بیٹی تھی، نہایت لائق اور فاضلہ خاتون تھی اس کے والد

شاہجہانی دربار کے ممتاز امرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ باپ نے بیٹی کو تمام علوم سے آراستہ کیا تھا۔ گھڑسواری، تیراندازی، فنونِ جنگ میں ماہر تھی۔ اورنگ زیب اور داراشکوہ کی لڑائی میں داراشکوہ کی طرف دار تھی۔ آرزم بیگم کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے عالمگیر نے اپنے چھوٹے بیٹے کام بخش سے ۱۰۹۴ھ میں شادی کردی۔ شادی کے بعد باہر گھوڑے کی سواری باغوں کی سیر وغیرہ پر پابندی لگادی گئی۔ یہ اس کی اہلیت اور لیاقت کا کتنا بڑا مظاہرہ تھا کہ آرزم بیگم نے اپنے اضطراب کا کبھی اظہار تک نہیں کیا۔ ایسی ہوتی ہے شوہر پرستی کی مثال، اس نے شوہر کی خوشنودی کو ہمیشہ مدِنظر رکھا، اس کی زندگی آج کی بیویوں کے لیے ایک بے مثال درس ہے۔

فخرالنساء بیگم :۔

یہ امیر تیمور کی بیوی سینا کی رہنے والی اور عربی النسل کی خاتون تھی بچپن میں شادی قاہرہ کے امیر کبیر سے ہوگئی۔ مگر یہ رشتہ بہت جلد ختم ہوگیا۔ پھر بیگم نے ایک لیفٹننٹ سے شادی کرلی مگر وہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد نہ معلوم کس طرح سے فخرالنساء بیگم امیر تیمور کی زوجیت میں آئی۔ یہاں اس کی قابلیت اور ذہانت کے جوہر سامنے آئے وہ بہت قابل اور خوبصورت خاتون تھی۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد وہ اس جہانِ فانی سے رُخصت ہوگئی۔ وہ نیک سیرت اور مذہبی خیالات کی خاتون تھی۔

سُلطان بیگم :۔

یہ خاتون شاہ طہماسپ فرماں روائے ایران کی بیٹی تھی، جلاوطنی کی حالت میں جب ہمایوں ایران پہنچا تو سلطان بیگم نے ہی اپنے والد اور بھائی سے سفارش کر کے ہمایوں کی مدد کی پوری مغلیہ سلطنت سُلطان بیگم کی اس امداد کا مقروض رہے گا۔ اگر سلطان بیگم جو نفسِ نفیس ہمایوں کی مدد نی تو مغلیہ حکومت ہندوستان میں قائم ہی نہیں ہوسکتی تھی۔

موتی بیگم :-

یہ شہنشاہِ اکبر کے سب سے پہلی بیوی تھی جو بہت ہی حسین و جمیل بیگم تھی مگر کچھ سخت مزاج تھی اسی لیے اکبر کے اور بیگم کے مزاج میں خاص فرق تھا۔ ۱۶۱۸ء میں موتی بیگم نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔

حاجی بیگم

یہ حسینہ اور پر جمال پری چہرہ خاتون ہمایوں بادشاہ کی بیوی تھی۔ حاجی بیگم حقیقت میں بڑی جاں باز، حوصلہ مند، بہادر عورت تھی۔ حاجی بیگم کا مقبرہ عرب سرائے کے متصل ہے۔

آرام جاں بیگم :-

یہ عصمتِ بے پناہ شریف خاتون نورالدین محمد جہانگیر کی پانچویں بیوی تھی جو بہت ہی حسین اور عقلمند خاتون تھی، آرام جاں بیگم اپنی حاضر جوابی اور شاعری کے لیے مشہور تھی۔ بیگم بہت ہی ذہین اور دانشور خاتون تھی۔" بیگمات خاتونِ تیموری کے مصنف سید ظہور الحسن دہلوی نے بیگم سے متعلق ایک حکایت تحریر کی ہے جس کے مطابق۔ ملاحظہ ہو:

> "ایک دفعہ جہانگیر بادشاہ ایک شہزادہ سے شطرنج کھیلتے ہوئے چال میں پھنس گیا اور بازی ہارنے کی شرط یہ تھی کہ ہارنے والے کو اپنی بیگم نذر کرنی پڑے گی۔ جہانگیر جب بازی ہارنے والا تھا تو پریشان گھبراتا ہوا محل میں نورجہاں کے پاس پہنچا، نورجہاں چال بتانے میں قاصر رہی پھر حیات النساءؔ کو طلب کیا مگر وہ بھی چال بتانے میں اُلجھ گئی۔ آخر میں آرام جاں جو شطرنج میں مہارت رکھتی تھی۔ جب جہانگیر نے اس کو نقشہ سمجھایا تو آرام جاں نے اس شعر کے ساتھ چال کو سمجھایا۔ ؎

"شاہانہ دو رُخ بد و دل آرام را مدہ
پیل و پیادہ پیش کس و اسپ کشت مات"

اس شعر کو سمجھ کر جہانگیر نے چال چلی اور بازی جیت گیا۔ اندازہ لگائیے کہ آرام جان بیگم کتنی ذہین تھی۔ اس کی ذہانت پر حیرت ہوئی ہے۔ اس شعر سے اس کی قابلیت اور ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

اکبر آبادی یا عزیز النساء بیگم :۔

اکبر آبادی بادشاہ شاہجہاں کی دوسری بیوی تھی، بیگم بہت ہی دلفریب نور کی پتلی اور پری چہرہ خاتون تھی، نزاکت اور صورت میں ملکہ رکھتی تھی۔ اکبر آبادی کسی بھی خوبی میں ممتاز محل سے کم نہیں تھی، رحمدل اور سخاوت کا اندازہ لگانا مشکل تھا، اکبر آبادی مذہبی خیالات کی خاتون تھی۔ ممتاز محل کے انتقال کے بعد اکبر آبادی کا بادشاہ پر مکمل اثر رہا۔ شاہجہاں کے بعد ۱۲ سال بعد تک بیگم زندہ رہی مگر اس حیا کی دیوی اور پرچشم خاتون نے ایک گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی عبادت میں زندگی بسر کی، چوتھی ذی الحجہ ۱۰۸۸ھ کو رہگزائے عالم بقا ہوئی۔ بیگم کی یاد کو قائم رکھنے کی غرض سے دہلی کے پاس فیض بازار میں اکبری بیگم کے نام سے ایک مسجد ایک مسافر خانہ اور طلباء کے لیے مکانات بنوائے۔ ان عمارات سے بیگم کی ذہنیت شعور اور حوصلہ مندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اورنگ آبادی محل :۔

یہ بیگم اورنگ زیب کی چوتھی بیوی تھی، اس کے حُسن و جمال اور عقلمندی نے اورنگ زیب پر اپنا اثر جما لیا تھا۔ اکثر معرکوں میں اورنگ آبادی محل اورنگ زیب کے ساتھ رہی۔ اورنگ زیب بیگم کی خوبیوں سے متاثر تھا۔ بیگم کے بطن سے صرف ایک لڑکی مہر النساء بیگم تھی جو بہت ہی ذہین اور حسین تھی شاہی محل کی بیگمات کو مذہبی مسائل کے درس دینا اور دیگر مسائل کو حل کرنے کے فرائض کو انجام دینا اورنگ آبادی محل کے سپرد تھے۔ ۱۱۱۶ھ میں بیگم صاحبہ نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ بیگم کی یاد میں پنجابی کٹرہ دہلی میں ایک شاندار مسجد سنگِ مرمر کی تعمیر کرائی۔

بائی اودے پوری :-

یہ خاتون راجہ اودے پور کی بلند اختر اور نیک دُختر تھی، وہ بہت ہی دلیر اور بہادر خاتون تھی، سپہ گری میں ماہر تھی، ہتھیاروں کو چلانے کا ہُنر آتا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر باغوں کی سیر کو جاتی تھی۔ اس کے حُسن کی تعریف اس زمانے کے مورّخین نے بھی کی ہے، ان سب خوبیوں سے متاثر ہو کر عالمگیر نے بائی اودے پوری کو شریکِ حیات بنا لیا۔

اشرف زمانی :-

اشرف زمانی کے والد محترم کابل کے باشندے تھے اور وہ سردار کے عہدہ پر رہ چکے تھے اسی لیے اُن کو کابلی سردار کہا جاتا تھا۔ ان کی دُختر اشرف زمانی بہت ہی نیک سیرت اور حسین صورت کی خاتون تھی وہ تعلیم و تربیت سے مکمل طور پر آراستہ تھی۔

اورنگ زیب نے جب اشرف زمانی کی خوبیوں کے بارے میں بیگمات سے سُنا تو اپنے بیٹے شہزادہ بہادر شاہ کی شادی اشرف زمانی سے کر دی۔ اشرف زمانی کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہیں۔

رحمت بانو بیگم :-

اس شریف عقلمند اور پاکدامن خاتون کے والد محترم کا نام زربان آشام تھا۔ رحمت بانو بیگم کے حالات کے بارے میں تاریخ خاموش ہے، اورنگ زیب عالمگیر کے بڑے بیٹے شہزادہ محمد معظم کی شادی رحمت بانو بیگم سے ہوئی، رحمت بانو بیگم نے شاہی حرم کی بیگمات کو اپنی خوبیوں سے متاثر کر لیا تھا۔

جانی بیگم

جانی بیگم کی زندگی کے حالات نہیں معلوم ہو سکے اتنا ضرور ہے کہ جانی بیگم بے حد حسین

اور ذہین خاتون تھی اور تعلیم و تربیت سے آراستہ تھی وہ بہت خوش مزاج خاتون تھی ۔ اورنگ زیب نے اپنے بیٹے محمد اعظم سے جانی بیگم کی شادی کر دی ۔

امتہ الحبیب بیگم :-

یہ معزز اور نیک سیرت حسین صورت خاتون محمد معظم شاہ عالم بہادر غازی بادشاہ بن عالمگیر کی عزیز اور چہیتی بیگم تھی امتہ الحبیب کے حسن و جمال کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اس زمانے میں امتہ الحبیب جیسی دانشور عقلمند اور ذہین خاتون کی مثال ایشیائی ممالک میں ملنا بڑا مشکل تھا ۔ بیگم کی یہ بڑی خوبی تھی کہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے حد رحمدل تھی وہ تمام ملازمین کو اولاد کی طرح سمجھتی تھی ۔ تمام مورخین نے امتہ الحبیب کی مردانگی ، شجاعت ، ہمت ، حوصلہ مندی ، اور استقلال کا تذکرہ کیا ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امتہ الحبیب بیگم میں حمیدہ بانو بیگم جیسے تمام اوصاف ملتے تھے ۔

ادہم یا قدسیہ بیگم :-

یہ زہرہ جبیں خاتون محمد شاہ کی بیگم تھی جو نہایت عیش و نشاط میں غرق تھا قدسیہ بیگم بھی بہت ہی حسین خاتون تھی ۔ بیگم کو شاعری سے بے حد دلچسپی تھی ، اس شاعری کے ذوق کا اندازہ ہمیں اس کے شعر سے ہوتا ہے وہ کہتی ہے کہ :

"ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا
کمبخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا"

شوہر کے انتقال کے بعد قدسیہ بیگم نے دہلی میں قدسیہ نام کا باغ لگوایا جو بہت ہی خوبصورت باغ تھا ۔ اس باغ میں ایک مسجد اور بارہ دری بھی تعمیر کرائی ۔ کبھی یہ عمارت اور باغ ہندوستان میں اپنا مقام رکھتے تھے ۔

چاند بی بی

(نادرۃ الزمانی)

کس غضب کی بو نکلتی ہے ترے پیغام سے

ہندوستان کی غیر فانی ہستیوں میں چاند بی بی کا نام ممتاز درجہ رکھتا ہے اور مادر وطن کی نسوانی فضا میں ہمت و دلاوری کی گونج پیدا کر رہا ہے چاندی بی بی کے کارنامے زرّیں لفظوں میں ہندوستان کے دل پر لکھے جا چکے ہیں۔ بقول مولانا علم الدین:

"چاند بی بی کی زندگی کے حیات افروز واقعات زبان حال سے پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورت کے وہ کمزور بازو اور نازک ہاتھ جو شیر خوار بچوں کو پنگھوڑہ ہلایا کرتے ہیں کبھی کبھی وہی ہاتھ قوموں، سلطنتوں اور انسانوں کی قسمت کا فیصلہ بھی کیا کرتے ہیں نیز عورت کے عزم اور ارادے کے مقابلے میں جری سپاہیوں کی دلیری فوجوں کی کثرت توپوں کی آتش بازی اور شاہانہ جاہ و جلال بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے"[1]

چاند بی بی کے والد نظام حسین شاہ والئے احمد نگر تھے چاند بی بی کی والدہ خدیجہ سلطان اپنے دور کے عقل و تدبرا اور جاہ و جلال کی زندہ تصویر تھی۔ چاند بی بی نے اسی لائق ماں کے آغوش میں تعلیم و تربیت پائی چاند بی بی ۱۵۴۷ء میں پیدا ہوئی۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت دکن کی پانچوں ریاستیں آپس میں دستِ گریباں ہو رہی تھیں، چاند بی بی فنونِ جنگ میں بھی ماہر تھی اور بہترین شہسوار اور بہادر سپاہی تھی۔ شمشیر زنی میں بھی ملکہ رکھتی تھی۔

وہ ہمیشہ شوہر کے ساتھ رہتی تھی اور دونوں میں بے پناہ خلوص و محبت تھی مگر ملال یہ تھا کہ کوئی اولاد نہیں تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ رنج و غم میں ڈوب گئی تمام سلطنت میں

---

[1] دختران ہند صفحہ ۲۷۶-۲۷۵

چاندبی بی

سازشوں کے جال بُنے جارہے تھے اور امن و امان بھی خطرے میں پڑ گیا۔ نو سال کے بھتیجے کی سرپرستی کرتے ہوئے سلطنت کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ اس پاک دامن عفیفہ نے تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اس نے ایک بار امراء کے سامنے اعلان کیا کہ :

"اگر نااتفاقی کا بیج بو دیا گیا تو اس کا پھل تباہی ہوگا۔ اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری خانہ جنگی سے بیجاپور کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ سلطنت کے دشمن جو موقع کی تاک میں بیٹھے ہیں سلطنت کو مردہ لاش سمجھ کر گدھوں اور چیلوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں گے اور ایک دن آنِ واحد میں اسے مٹا کر رکھ دیں گے۔"[1]

چاند بی بی کے خلاف ہر روز نئی نئی سازشیں ہوتی رہیں اور امراء میں باہمی اختلافات پیدا ہوتے رہے ایک موقع پر چاند بی بی پر الزام لگایا کہ وہ بیجاپور کی خفیہ باتیں احمد نگر پہنچاتی رہتی ہیں۔ احمد نگر میں چاند بی بی کے رشتہ داروں کی حکمرانی تھی آخر کار ایک دن چاند بی بی کو اسی الزام میں گرفتار کر کے ستارہ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور اس کی کنیزوں کو برہنہ کر کے شہر کے باہر نکال دیا۔ مگر جب ان لوگوں کو بے گناہی کا علم ہوا تو کشور خاں نے چاند بی بی کو قلعے سے باہر نکال لیا۔ مجبور ہو کر چاند بی بی نے اب ہاتھ میں تلوار لے لی اور جان کی بازی لگا کر دشمنوں کا مقابلہ کیا، کچھ دن بعد دشمنوں نے بیجاپور پر دھاوا بول دیا۔ چاند بی بی نے جم کر میدان میں مقابلہ کیا۔ آخر میں دشمن کو شکست فاش ہوئی اس طرح بی بی نے بیجاپور کے سپاہیوں میں ایک نیا حوصلہ اور جوش بیدار کیا۔ 'کس غضب کی بو نکلتی ہے ترے پیغام سے'

بیجاپور دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوا، جگہ جگہ عمارات مساجد، خوبصورت محل، تفریح گاہیں بنوائی گئیں اور دیکھتے دیکھتے بیجاپور ایک عالیشان شہر بن گیا۔ چاند بی بی نے والئے احمد نگر سید مرتضیٰ نظام جو بی بی کا بھائی تھا۔ اس کی شادی ابراہیم کی ہمشیر سے کرادی یہ شادی سیاسی اعتبار سے مفید ثابت ہوئی اور دونوں ریاستیں اتحاد کے رشتہ میں بندھ گئیں پھر چاند بی بی احمد نگر چلی گئیں اور انھیں اب سیاسی زندگی سے کچھ نفرت سی ہوگئی۔ چاند بی بی نے کہا کہ :

---

[1] دختران ہند ص ۲۸

"دنیا خیر و شر کی رنگینیوں اور رنج و راحت کے کرشموں کا تعجب انگیز مجموعہ ہے جس کے جیب و دامن طرح طرح کے تغیرات و انقلابات سے ہر وقت معمور رہتے ہیں سیاست ایک ایسا سراب ہے جس کے دعوے میں مبتلا ہو کر پریشانی رسوائی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، سیاسی آدمی کی شہرت بے بنیاد ہوتی ہے سیاسی جوڑ توڑ کا نتیجہ جھوٹی واہ واہ اور مصنوعی خوشی ہوتی ہے اور سیاست دانی کا انجام ضمیر کشی اور ایمان فروشی ہے سیاسی تدبر کبھی تو کامیابی کے پروں پر اُڑ کر فوق السماء تک جاتا ہے کبھی ناکامی کا شکار ہو کر تحت الثریٰ میں پٹخنیاں کھاتا دکھائی دیتا ہے اگر اس کے حلق میں شیرینی کا ایک لُقمہ پہنچتا ہے۔ تو اس میں زہر کی سو تلخیاں بھی شامل ہوتی ہیں اس کے دامن سے صبح عیش طلوع ہوتی ہے لیکن اُفق سے شام کدورت بھی اپنا بھیانک چہرہ دکھاتی ہے ..... تمام عمر ستاروں سے پھول چننے شبنم سے کنواں بھرنے اور پانی کے بلبلوں سے دامن پر کرنے میں ضائع کر دی ہے اب میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں ملکی سیاست سے کنارہ کش ہو جاؤں اور اللہ اللہ کر کے آرام و اطمینان کا سانس لوں"[1]

احمد نگر آکر چاند بی بی نے خاندانی رنجش اور خانہ جنگی دیکھی، بی بی سے نہ رُکا گیا پھر سیاسی میدان میں اُترنا پڑا۔ پیرانہ سری میں بھی چاند بی بی کے عزائم جواں تھے۔ وہ مورچوں کا معائنہ، فوجوں کے قواعد، قلعوں کا انتظام، لشکروں کی نقل و حرکت جنگ کے سامان و رسد کا بندوبست غرض ہر چیز کی دیکھ بھال خود کرتی تھیں بی بی احمد نگر کے قلعے کو مضبوطی سے سد سکندری بنایا۔ ایک بار ۱۵۹۵ء میں جب شہزادہ مراد اور خانخانا احمد نگر پر حملہ کرنے کی غرض سے پہنچے تو چاند بی بی نے شہزادہ کو پیغام بھیجا کہ "اگر صاحب عالم سلطنت احمد نگر کے دوست بن کر آئے ہیں تو بسر و چشم تشریف لائیں نظام شاہیہ سلطنت کا ایک ایک فرد خدمت گزاری کے لیے موجود ہے اور اگر صاحب عالم کی نیت فاسد ہے اور ملک گیری کا جذبہ انہیں یہاں لایا ہے تو نہیں میدان وہیں چوگان تلوار خود اس چیز کا فیصلہ کر دے گی کہ اصل حقدار کون ہے"[2]

---

[1] دختران ہند ص ۲۹۷ - ۲۹۶ [2] ایضاً " "

چاند بی بی نے احمد نگر کے امیروں کو ایک بار پھر ہوشیار کیا کہ "ان کی نااتفاقی کا گناہ ملک وسلطنت کو تباہ کر دے گا۔ احمد نگر تیموریہ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہو جائے گا اور ان کے اہل وعیال کو لونڈی و غلام بنا لیے جائیں گے۔ جہاں نظام شاہانہ سلطنت کا پرچم لہراتا ہے وہاں اکبری علم اڑتا دکھائی دے گا۔ ان کی عزت اسی میں ہے کہ وہ غیر ملکی حکومت کے اثر سے ہمیشہ آزاد رہیں اور اپنے کندھوں پر غلامی کا جوا نہ پڑنے دیں۔" بی بی کی اس تقریر کا امراء پر گہرا اثر ہوا۔

آخر کار مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا چاند بی بی نے ہمدان میں بہت بہادری سے مقابلہ کیا دشمن کے چھکے چھڑا دیے اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ شہزادہ جو خود بہادر تھا اور بہادروں کی قدر کرتا تھا چاند بی بی کی بہادری دیکھ کر اس کا مدّاح بن گیا۔ بی بی بہت ہی دلیر، شیر دل بہادر اور مجاہدہ خاتون تھی شہزادہ نے چاند بی بی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ :

"آپ میں وہ اوصاف ہیں جو ایک بہادر سلطان اور بیدار حکمراں میں ہوتے ہیں اور آپ مُلک کی حقیقی خیر خواہ ہیں۔"

اس کے بعد چاند بی بی کو چاند سلطانہ کے نام سے ہر خاص و عام پکارنے لگا۔

تیموری مؤرخ اسے بیگم سلطان کے لقب سے یاد کرتے ہیں مغلوں نے احمد نگر سے فوجیں ہٹالیں اور برار پر قبضہ کر لیا تو ایک بار پھر اندرونی حالات کی بنا پر احمد نگر کا نظام درہم برہم ہو گیا اور حمید خاں نے چاند بی بی کو قتل کر دیا۔ بی بی صاحبہ ملکہ الزابیتھ انگلستان کی ہمعصر تھی اور سیاسی شعور میں کسی سے کم نہیں تھی وہ خوشامد پسندی سے نفرت کرتی تھی خود اعتمادی پر تعین کرتی وہ بہت ہی ذہین اور تیز فہم خاتون تھی وہ پاک دامن قدسی صفت اور اعلیٰ اخلاق کی خاتون تھی اس نے اپنی جنگی سرگرمیوں کی مصروفیات کے باوجود میدانِ جنگ تک میں پردہ نہیں چھوڑا اور چہرہ پر نقاب پوش میدان میں اترتی تھی وہ رحم دل نوع انساں سے بے حد ہمدردی رکھتی تھی اس میں مادر وطن کی محبت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے پڑے تھے۔

چاند بی بی کی تقریریں جادو کا اثر تھا۔ چاند بی بی نے ایک دفعہ پُر جوش الفاظ میں کہا کہ :

"دشمن دروازہ پر کھڑا ہے تم خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے تو بیجاپور دوسری ریاستوں

کے زیرِ نگیں ہو جائے گا اور رہی سہی وہ آزادی جو تمہیں زندگی سے زیادہ عزیز ہے دشمنوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی پھر ہاتھ ملتے رہ جاؤگے اٹھو اور آزادی کے لیے مر مٹو۔"

اپنی آن بان، شان پر مر مٹنا ایمان کا جز سمجھتی تھی وہ اسی لیے بڑی سے بڑی قربانی کو تیار رہتی تھی ایک واقعہ کے مطابق ایک دفعہ اس کے شوہر کے دشمن رات کو اس کے محل میں اس کے شوہر کو (علی عادل شاہ) قتل کرنے آ گئے، شوہر بے خبر سو رہے تھے۔ اور چاند بی بی حفاظت کر رہی تھی شوہر کو جگائے بغیر چاند بی بی نے دونوں دشمنوں کو قتل کر دیا اس طرح اپنے شوہر کی جان کی حفاظت کی۔

ایسی قابل فخر بہادر خواتین روز روز کہاں پیدا ہوتی ہیں۔ حقیقت میں۔ احمد نگر کے شاہی خاندان کی شمع نے اسے حسن دریا دلی سے بخشا تھا۔ درمیانہ قد، دُبلا پتلا مگر موزوں بدن تیکھے نقش موٹی موٹی دلکش کا کریزی آنکھیں لمبی لمبی پلکیں پیوستہ ابرو بلند پیشانی غنچہ دہن سڈول اور شفاف دانت اور گلابی ہونٹ تھے، وہ عربی اور ترکی زبان فصاحت کے ساتھ بولتی تھی کنارہی اور مرہٹی زبانوں پر بھی اسے خاصی دسترس تھی، مصوری اور علم موسیقی کا بے حد شوق تھا گھوڑ سواری کی بڑی شائق تھی شوہر کے ساتھ ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہمراہ جاتی تھی اور شکار کے وقت شیر اور چیتے کی بھی پرواہ نہیں کرتی تھی۔

چاند بی بی نے احمد نگر اور بیجاپور کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم کیا۔ جنوبی ہند کی تمام شہزادیوں کو اپنا گرویدہ بھی کیا شوہر کو مطیع کیا اور رعیت کو تابع فرمان بنایا، وہ اتنی خوش نصیب تھی کہ:

"غم کے پر اس کے قریب آتے ہوئے جلتے تھے"

حضرت محل بیگم

بیگم حضرت محل (شانِ اودھ)

" ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے "

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بادشاہ بیگمات، راجے مہا راجے و ہر خاص و عام انگریز حکومت کے خلاف مقابلہ کے لیے کفن بردوش میدان میں اتر آئے بہادر اور جیالی خواتین میں بالخصوص بیگم حضرت محل، جھانسی کی رانی، دہلی کی سبز پوش عورت، عزیزن، جھانسی کی گم نام شہید مسلم خاتون وغیرہ نے ملک و قوم کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی سے یہ ثابت کردیا کہ ایک زندہ قوم کی خواتین کے عزم اور حوصلے اس طرح کے ہونے ہیں انھوں نے اپنے مجاہدانہ کاموں سے مادرِ وطن کی مٹی کی خاطر وہ قرض ادا کیے جو ان پر واجب بھی نہیں تھے۔

"مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے — وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے"

ان بہادر اور غیرت مند خواتین کا نام ہندوستان کی تاریخ میں مجاہدینِ آزادی کی صفِ اوّل میں سنہرے الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ ان خواتین نے اپنی قربانی جرأت و شجاعت کی وہ روشن مثالیں پیش کیں، جن کو ہندوستان کی تاریخ ہزاروں سال تک پیدا نہیں کرسکتی ان خواتین کے کردار زندہ قوم کے لیے حیرت ناک نمونے ہیں' ان خواتین نے یہ ثابت کردیا کہ شہید کی موت قوم کی حیات ہوتی ہے ہر مصیبت کے نازک موڑ پر یہی ثابت کرتی رہیں کہ:

قافلے شوق کے رکتے نہیں دیواروں سے
سیکڑوں مجلس و زنداں کے دیار آئے ہیں

بیگم حضرت محل کی سوانح اس پردہ نشین خاتون کی تاریخ ہے جو قوم و ملت کے لیے مجاہدانہ اور غیرت و حمیت، ایثار و قربانی کے جذبات سے بھرپور ہے۔ اس جاں باز خاتون نے ہر قید و بند میں اپنی صلاحیت اور قابلیت کے جوہر دکھائے حقیقت میں حضرت محل کے کارنامے مسلم خواتین کے لیے درس دے رہے ہیں۔

بیگم حضرت محل کا اصلی نام محمدی بیگم تھا جسے بچپن میں امراؤ کے نام سے پکارتے تھے محمدی بیگم اودھ کی راجدھانی فیض آباد کے ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی ہوش سنبھالتے ہی واجد علی شاہ کی شریکِ حیات بن گئی امراؤ — واجد علی شاہ کی محفلوں کے اندر سبھا اور پری خانہ میں پہونچ کر مہک پری کے نام سے پکاری جانے لگی، مہک پری کے پہونچنے سے پری خانہ کی زینت کو چار چاند لگ گئے۔ واجد علی شاہ نے مہک پری کو افتخار النساء خانم کا خطاب عطا کیا اور واجد علی شاہ اس کی فہم و فراست حسن و سیرت وصورت پر گرویدہ ہو گیا۔ اب داستان تاریخی منزلوں کو چھونے لگی۔ مہک پری کے حسن و جمال کے بارے میں اپنے خود نوشت روزنامچہ میں واجد علی شاہ رقمطراز ہیں:

وساطت جو امامن نے دی — میرے گھر میں آئی زن خانگی
پسینہ تھا خوشبو اس کا گلاب — پری تھی مہک اس نے پایا خطاب
لگی ہونے تعلیم رقص و سرود — شب و روز تفہیم رقص و سرود

پہلے تو مہک پری نے واجد علی شاہ کے پری خانہ میں رقص و سرود سیکھا اور پری خانہ کو حقیقت میں مہک پری نے اپنے بے پناہ حسن کے نور سے منور کر دیا اب پری خانہ نور کی محفل بن گیا۔ لیکن قدرت نے بیگم کو پری خانہ کی جھنکار میں غرق ہونے کے لیے نہیں بلکہ امراؤ کو اہلِ ہند بالخصوص اہلِ اودھ کو ایک نیا ساز ایک نئے نغمہ کے لیے پیدا کیا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں بیگم نے شہرت اور عزت حاصل کر لی اور ان کے بطن سے برجیس قدر کے پیدا ہونے سے ان کی عظمت اور بلند ہو گئی۔

بیگم حضرت محل مادرِ وطن کی وہ مایۂ ناز بیٹی ہے جس پر ملک فخر کرتا ہے۔ بیگم نے اپنی شجاعت اور ہمت الوالعزمی اور دانشمندی سے عیار دشمن کا مقابلہ کیا جو جذبۂ وطنیت سے حد درجہ سرشار تھی جس نے آزادیٔ وطن کی راہ میں بخوشی اپنے عزیز ترین فرزند کی بازی لگا دی، جس نے ہزارہا آلام و مصائب برداشت کیے لیکن دشمن کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا یہاں تک کہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے اور بالآخر غریب الوطنی میں کشمکش زیست سے نجات

حاصل کی اس مجاہدہ کی آخری آرام گاہ کاٹھمنڈو جو نیپال کی راجدھانی ہے میں اسی کی بنوائی مسجد میں ہے۔"

۱۸۴۷ء میں جب واجد علی شاہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے تو سلطنتِ اودھ اپنے ایک اہم تاریخی موڑ پر آچکی تھی، حضرت محل کو نواب بیگم حضرت محل کا خطاب مل چکا تھا۔ بیگم ایک وفا شعار بیوی اپنے محبوب شوہر سے شاداں تھیں۔ اودھ میں اس وقت قوسِ قزح کے رنگ و نور کا ایک دریا موجزن تھا۔ لیکن رنگ و نور کے ان دھاروں کے پیچھے جو طوفان تیزی سے کروٹیں بدل رہا تھا وہ بیگم کی وقت شناس نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا، ان کے حساس دل و دماغ نے اودھ کے اردگرد سنہرے جال کو مضبوط تر ہوتے دیکھا اس وقت دربار اودھ سیاسی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی سرنگ تھی (ناسور بن چکی) تھی۔ عنانِ حکومت دراصل اودھ کے لیے تاج بادشاہ ریزیڈینٹ کے ہاتھوں میں تھی اور شاہ اودھ کی حیثیت محض شطرنج کی بساط کے ایک لاچار مہرہ جیسی تھی۔

بیگم حضرت محل نے اودھ کے اقتدار کے مٹنے کے اس سیاسی المیہ کا بطور مطالعہ کیا اب بیگم نے ہندوستان کے سیاسی نقشہ کی سیماب کی مانند بدلتی ہوئی حدبندیوں کا شعور سیاستداں کی عمیق نظروں سے مطالعہ کیا اور خود آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔

اس وقت ہندوستان کا گورنر جنرل ڈلہوزی تھا جس کی دیسی ریاستوں کی بے جا الحاق کی پالیسی نے ملک میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ ۱۸۵۶ء کو اودھ کے الحاق کا اعلان کرنے واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ کے مٹیا برج بھیج دیا۔ کچھ بیگمات نواب صاحب کے ساتھ چلی گیئں اور کچھ قیصر باغ کے محلوں میں ہی مقید رہی۔

بیگم حضرت محل کے لیے یہ لمحہ بڑے صبر آزما کا تھا ایک طرف شوہر کی جدائی دوسری طرف وطن کی آبرو کی حفاظت کرنا تھا۔ بیگم صاحبہ نے لکھنؤ پر آن پڑی بپتا کے تحفظ کے لیے آخری فیصلہ کیا۔

"یہ فیصلہ ایک تاریخ ساز فیصلہ تھا" باشندگانِ اودھ بیگم کے اس فیصلہ کے لیے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے"۔

واجد علی شاہ کے بعد لکھنؤ میں بدیسی جابر و غاصب حکمرانوں نے ظلم و تشدد کے وہ مظاہرے کیے جن کے تصوّر سے تاریخِ انسانیت آج بھی کراہ اٹھتی ہے۔ ان حریص نظروں نے بیگم صاحبہ کو مختلف طرح سے نقصان پہنچانا شروع کردیا۔ بیگم صاحبہ نے محمد خان اور دیوان ٹھاکر پرشاد کی مدد سے اپنی شان و شوکت پر حرف نہ آنے دیا اور کمپنی کی کبھی خوشامد نہیں کی۔ لکھنؤ کے ہر دل میں انگریزوں کے خلاف آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ مگر جب فریب اور بربریت کی سیاہ چادر نے یہاں کا سکون چھین نا چاہا تو اسی سرزمین سے ہزاروں جاں باز حریت پسند وطن کی آزادی اور قومی یک جہتی کا پرچم لے کر میدان میں اتر پڑے۔ شمع آزادی کے ان پروانوں کی رہبری بیگم حضرت محل نے کی۔ نہ تو اقتدار کی ہوس تھی نہ دولت کی طمع اب ازسرِ نو نئی مملکت کی تشکیل کرنا تھا اسی لیے دشمن کو پسپا کرنا اصلی مقصد بنایا۔

۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو شہنشاہ بہادر شاہ کے وزیر کی حیثیت سے گیارہ سالہ برجیس قدر کو تخت پر بٹھایا گیا اور بیگم حضرت محل مشیرِ خاص قرار دی گئیں۔ یہ بیگم کے لیے سخت امتحان کا وقت تھا۔ بیگم نے اپنی سیاسی بصیرت کا یہی نہیں ثبوت دیا بلکہ ۱۸۱۴ء میں ہوئی اودھ کی غلطی کا بھی ازالہ کیا۔

۶ر جولائی کو بیگم حضرت محل نے تمام فوجی اور غیر فوجی حکام کو اکھٹا کیا اور انگریزوں کی چالو، سیاسی حالات، اپنے فرائض اور عیار دشمن سے لڑنے کے لیے تیار رہنا اور سامان مہیا کرنے کے لیے آگاہ کیا۔ لڑائی کے سامان و رسد کے لیے اپنا ذاتی اثاثہ نقد، جواہرات وغیرہ سب کچھ دیدیا۔ حکام کو خلعتیں اور خطاب عطا کیے گئے، اودھ اور بیرونِ اودھ کے مجاہدین سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کیا۔

حقیقت میں جو جنگ بیگم حضرت محل نے لڑی وہ جنگِ آزادی تھی نہ کہ خود غرض سوزش پسندوں کی بغاوت اور فساد انگیزی کے بارے میں لوگوں کا جو خیال

ہے وہ تاریخی حقائق سے دور ہے بیگم صاحبہ نے برجیس قدر کے نام سے جو فرمان جاری کیا اس کو اودھ کے لوگوں نے بہت پسند کیا فرمان ملاحظہ ہو۔

فضلِ خُدا سے بتاریخ سعید روز نیک ما بدولت و اقبال نے مسندِ آبائی پر جلوہ فرمایا تمہیں لکھا جاتا ہے کہ کوئی انگریز مع فوج واہل کار کسی گھاٹ سے تمہارے حلقہ میں اترنے نہ پائے جس طرح ہو مقابلہ کرنا اور بغور دیکھنے کا حکم نامۂ لہٰذا فوج و توپ در وقت پر حاضر ہونا تاکید جانو۔"

انگریزی فوج کے مقابلہ میں بیگم کو ایک طرف تو عیار دشمن سے ٹکر لینا دوسرے کچھ ضمیر فروش ہندوستانی بھی آستین کا سانپ بنے ہوئے تھے۔ چند شاہی بیگمات بھی حضرت محل سے حسد کر رہی تھیں، ان کی سازشوں نے بھی ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا تھا۔ ہر ایک انگریزوں کی مدد سے اپنے بیٹوں کو تخت پر بٹھانے کی غرض میں مخالفت پر تلی ہوتی تھیں ایسے نازک دور میں بیگم نے مناسب قیادت کر کے اتحاد قائم کیا اور بتایا کہ: "ہماری آزادی اور ملک و قوم کا سب سے بڑا دشمن فرنگی نہیں آپسی کھوٹ اور جھگڑے ہیں" اس وقت بیگم صاحبہ نے فوج کی کمان خود سنبھال کر اپنی حوصلہ مندی کا ثبوت دیا اور اس وقت لکھنؤ کے قیصر باغ کی جو لکھی محل میں بیگم صاحبہ مقیم تھیں، مجاہدین نے نئے جوش کے ساتھ حملہ کر کے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ قیصر التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ:

> "حضرت محل کی سرکردگی میں صرف گیارہ روز میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریز عمل داری خواب معلوم ہوتی تھی۔"

مگر فتح کی خوشی بہت جلد شکست میں بدل گئی حالات بالکل بدل گئے۔ انگریزوں نے لکھنؤ کے عالم باغ پر قبضہ کر لیا۔ اب انگریز شہر کے حدود میں داخل ہو گئے پھر دشمن نے قیصر باغ کا رخ کیا۔ بیگم اور برجیس قدر کی جان خطرہ میں تھی۔ ۱۴ مارچ ۱۸۵۸ء کو قیصر باغ بھی دشمن کی زد میں آگیا برجیس قدر اور اپنی جان خطرہ میں دیکھ کر خیر خواہوں اور چوکی کی بیگمات کے

ساتھ مولوی گنج پہنچیں پھر حسین آباد ہوتی ہوئی موسیٰ باغ پہنچ کر پناہ لی۔ قیصر باغ پر بیگم کے ہٹتے ہی مکمل انگریزوں کا قبضہ ہوگیا پھر پورا شہر اجڑنے لگا۔ انگریز جنرل اوٹرم نے بیگم کو پیغام بھیجا کہ : " جنگ سے دست بردار ہو جاؤ، ہم واجد علی شاہ کا ملک بدستور آپ کے حوالے کردیں گے"۔ لیکن دشمن کے آگے سر جھکانا بیگم نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اب بیگم صاحبہ ایک لاکھ ہمراہیوں کے ساتھ لکھنؤ سے بہرائچ کے پاس بونڈی کے قلعہ میں پہنچ گئیں مگر قسمت نے یہاں بھی ساتھ نہ دیا۔ بیگم نے انگریزوں کے خلاف نیپال سے مدد چاہی مگر مدد نہ مل سکی آخر کار بیگم صاحبہ برجیس قدر کے ساتھ نیپال پہنچ گئیں۔ وطن سے دور نیپال کے ایک گمنام گوشے میں بیگم صاحبہ برجیس قدر کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں اور نیپال کی راجدھانی کاٹھمنڈو میں بیگم صاحبہ نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور یہی مسجد بیگم کی ابدی آرام گاہ ہے۔

بیگم حضرت محل کا انتقال اپریل ۱۸۷۹ء کو ہوا۔ مگر ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کا بیان ہے کہ بیگم حضرت محل کا انتقال ۱۸۷۴ء کو ہوا۔

نیپال پہنچ کر بیگم صاحبہ نے تمام زمینداروں اور تعلق داروں کے نام احکام جاری کیے کہ " ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا دفع کفار فرہنگ لازم ہے، باہم شریک ہوکر باقی ماندگان گارد کو قتل کر دو جوان کو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہوگا۔ بیگم حضرت محل کی مشاورتی کمیٹی میں ہندو مسلم دونوں برابر کے شریک تھے تمام امور سلطنت کمیٹی کی رائے سے طے ہوتے تھے۔ بیگم صاحبہ نے بھی رانی لکشمی بائی کی طرح عورتوں کی ایک تنظیم بنائی۔ نیپال سے حضرت محل نے یہ اعلان کیا کہ "ہندوستان کی جنگِ آزادی کا یہ اختتام نہیں آغاز ہے"۔ ان کا یہ قول صحیح ثابت ہوا اور ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں نے جنگِ آزادی کی جو شمع روشن کی تھی ۱۹۴۷ء تک وطن پرستوں کے سینوں میں مشعل بن کر بھڑکتی رہی"۔

ارضِ ہند کی اس غیرت مند خاتون نے بدیسی جبر و استبداد کا دو ڈھائی سال مقابلہ

کیا اور ہتھیار ڈالنے کے بجائے نیپال کی دشوار گزار گھاٹیوں میں گزاری اور جلا وطنی کی زندگی کو ترجیح دی۔

"بیگم حضرت محل نے یہ جنگ تو ہاری مگر ہمت نہیں ہاری"، اور بار بار کہتی رہیں کہ "ہندوستان کی آزادی کا اختتام نہیں آغاز ہے"۔ بقول چارلس پال کہ "ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے بعد بھی اودھ کی رعایا میں اپنے محبوب بادشاہ کے لیے ہی جوش و خروش تھا۔ وکٹوریہ کے اعلان کے چھ مہینے بعد بھی شنکر پور، ڈھوڈھیا، کھیڑہ، رائے بریلی اور سیتاپور وغیرہ میں برابر لڑائی چلتی رہی"۔[1]

لکھنؤ میں تو دلکشا باغ، قدم رسول، بیگم کوٹھی، سکندر باغ، موتی محل، شاہ نجف قیصر باغ وغیرہ میں تو ہر طرف موت کا بازار گرم رہا، مگر انگریزوں نے اس پر قابو پا لیا تھا احمد اللہ شاہ بیگم حضرت محل کے مشیر خاص تھے۔ مصنف رُسل کا ارشاد ہے کہ "بیگم حضرت محل بہت ہی ہوشیار، قابل اور دور اندیش خاتون تھی۔ مورّخ مجمدار کا بیان ہے کہ "بیگم حضرت محل اور احمد اللہ شاہ کی موجودگی ہی فوج کے لیے باعثِ تقویت تھی"۔

گیبرٹ اور ٹامس۔ بیگم حضرت محل کی خوبیوں کی تعریف کرتے ہیں ان کا بیان ہے کہ بیگم حضرت محل نے اعلان کیا کہ انسان کے لیے چار چیزیں بہت ضروری ہیں:۔

(۱) مذہب (۲) عزت (۳) زندگی (۴) دولت

محترمہ ڈاکٹر سمیع الدین نے اپنی معروف تصنیف میں تحریر کیا ہے کہ "بیگم حضرت محل کا شمار ان ہستیوں میں ہوتا ہے جن کے ہاتھوں آزادی کی شاندار فتح کی اینٹ اول رکھی ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانہ میں اودھ کے باغی سپاہیوں کی قیادت کا بارگراں اپنے کاندھوں پر اٹھا کر انھوں نے جن غیر معمولی جرأت بہادری اور ذہانت کا ثبوت دیا اسے جنگِ آزادی کی تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا۔

---

[1] اودھ جنگِ آزادی ص ۱۵۰۔ تاریخ بغاوت ہند از چارلس پال جلد دوم

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے جواب میں بیگم حضرت محل نے ایک مدلل اور دندانِ شکن اعلان اودھ کی رعایا کے نام شائع کرایا بیگم نے اس اعلان میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے تارپود بکھیر کر رکھ دیئے۔

ملکہ وکٹوریہ نے اہل ہند کے نام جاری کردہ پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کے اپنے اعلان میں بہت سے وعدے کیے اور ایک انصاف پسند حکومت کا جال ہندوستانی ذہن کو جکڑنے کے لیے پھینکا۔ وکٹوریہ کے جواب میں بیگم حضرت محل کا اعلان ان کی سیاسی بصیرت، دلیری اور بے خوفی کا مظہر ہے اس اعلان میں بیگم نے انگریزوں کی عیارانہ چالوں، جھوٹے وعدوں اور مکروہ حکمتِ عملی کو بے نقاب کیا۔ بیگم کا یہ اعلان اودھ میں گونج اٹھا۔

"پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کا اعلان جو ہمارے پیشِ نظر ہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ بہت غور و خوض کے ساتھ ہم موجودہ اعلان شائع کرتے ہیں تاکہ متذکرہ اعلان کی غرض و غایت اجاگر ہو جائے اور ہماری محبوب رعایا کی آنکھیں کھل جائیں.... لوگوں کو چاہیے کہ اس چال کو خوب سمجھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان کو اپنے آہنی پنجہ میں جکڑ کر بند کر رکھا ہے..... انگریزوں نے سب قول و قرار بالائے طاق رکھ کر باوجود اس امر کے کہ انگریز ہمارے کروڑوں روپیہ کے دین دار تھے۔ انھوں نے بلاسبب اس حیلہ سے کہ رعایا آپ سے مطمئن نہیں ہے۔ ہمارا ملک اور کروڑوں کا مال و اسباب ہم سے چھین لیا اگر رعایا سابق حکمران واجد علی شاہ سے غیر مطمئن تھی تو وہ ہم سے کیوں کر مطمئن ہو گی۔"

بیگم کی ان دلیلوں کا جواب حیلہ ساز انگریزوں کے پاس نہ تھا لیکن بیگم کی یہ سب کوششیں بے سود تھیں، دہلی، کانپور، جھانسی اور لکھنؤ پر انگریزوں کا مکمل تسلط ایک حقیقت بن چکا تھا۔ بیگم کو خیال آتا تھا کہ :-

"آہ واجد میں ان عمارتوں پر جہاں کبھی جانِ عالم ہنستے کھیلتے تھے اس سبزہ زار میں جہاں غنچے مہکتے جہاں بادِ صبا بھی سرگوشیاں کرتی تھی ایک طوفان برپا تھا ان

روشوں پر جہاں کبھی نازک اندام قدم رکھتے تھے۔ آج کشت وخوں ہو رہا تھا وہ برگِ گل جن کو ہر صبح شبنم نکھارتی تھی آج لہو سے سرخ رو تھے۔"

اعلان میں بیگم حضرت محل نے آگاہ کیا کہ اگر یہ صورت رہی تو پھر جدید اصلاح کی ہوئی کمپنی پہلے راجہ بھرت پور کو اپنا بیٹا بنایا اور پھر اس غریب وبیکس کا علاقہ ہتھیا لیا۔۔۔ ٹیپو سلطان سے کمپنی کی بدعہدی عالم آشکارا ہے، لاہور کے راجہ دلیپ سنگھ کو خداوندان کمپنی حیلہ سے لندن لے گئی پھر انھیں ہندوستان آنے کی اجازت نہ دی۔ نواب شمس الدین خاں کو — انھوں نے تختہ دار پر لٹکایا اور دوسری طرف ان کی عقیدت مندی کے گن گائے پیشوا کو پونا اور ستارہ سے باہر نکال دیا اور زندگی بھر بھٹور میں نظربند رکھا راجہ بنارس کو آگرہ میں قید رکھا۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ کے فرماں رواں کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ فوج کے اخراجات کو پورا کرنے کے حیلہ سے کمپنی نے ہمارے آمدنی کے علاقے کے لیے اور یہ بھی کہا کہ پھر کبھی ہم آپ سے خواستگار نہ ہوں گے۔ اگر یہ انتظامات قائم رہے تو اگلی اور موجودہ حالت میں کیا فرق ہوا۔ پھر کیا سبب ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیتے۔ اعلان میں یہ بھی مذکور ہے کہ ملکہ انگلستان کو اپنا علاقہ بڑھانے کی خواہش نہیں ہے لیکن پھر بھی دیسی ریاستوں کو اپنی مملکت میں شامل کرنے سے باز نہیں رہیں۔۔۔۔ اعلان میں یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ عیسائی مذہب برحق ہے لیکن دوسرے مذہب والوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے اور سب لوگ ایک ہی قانون کے تابع ہوں گے مگر عدل پسند حکومت کو کسی مذہب کے برحق وباطل ہونے سے کیا سروکار، سود کھانے شراب پینے کو جائز قرار دینے چربی لگے کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنے مٹھائیوں میں سور کی چربی کی آمیزش سڑکوں کی تعمیر کے حیلہ سے مسجدوں اور مندروں کو منہدم کر کے گرجے بنانا گلی کوچوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لیے پادریوں کو بھیجنا ان سب باتوں کی موجودگی میں لوگ کیسے بھروسہ کر سکتے ہیں کہ ان کے مذہب میں دست اندازی نہ کی جائے گی۔۔۔۔۔۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے انگریزوں کا خون بہایا ہے یا قتل میں کسی طرح کی مدد کی ہے ان کو سزا نے قانونی بھگتنی ہوگی۔۔۔۔۔ اس اعلان کو پڑھ کر جس میں عناد دشمنی جھلک رہی ہے ہم اپنی عزیز رعایا کی حالت پر بہت غمگین ہیں۔" (لکھنؤ اور جنگِ آزادی ص ۴۸-۴۷)

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کا اثر حضرت محل کے اعلان سے اس طرح ختم ہو گیا جیسے آفتاب کی شعاعوں سے شبنم اُڑ جاتی ہے۔ مگر حالات بالکل بدل چکے تھے۔ آخر ناکام ہونا پڑا۔

شیخ تصدق حسین نے اپنی معروف تصنیف "بیگماتِ اودھ" میں مندرجہ ذیل بیگمات کی فہرست پیش کی ہے جس کو بیگم حضرت محل کی سوانح کے ساتھ تحریر کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ان میں بہت سی بیگمات کی رشتہ داری مغلیہ خاندان سے بھی تھی۔ ان بیگمات کے نام اس طرح تحریر ملتے ہیں نواب صدر جہاں بیگم، عالیہ سلطان بیگم، نواب شمس النسا بیگم۔ افضل بیگم، ٹاٹ محل، سنگی خانم، نواب بادشاہ بیگم، نواب مُبارک محل، سُلطان مریم بیگم، سرفراز محل، ممتاز محل، ممتاز محل نالی، نواب سُلطان بہو صاحبہ نواب ملکہ زمانیہ، تاج محل نواب بادشاہ محل، صاحبہ محل، پھول محل، نواب مخدومۂ عالیہ، قدسیہ محل، کنگلا محل، نواب آفاق، ملکہ کشور صاحبہ، سُلطان محل، سلطان محل دوم، نواب حضرت محل، مخدومۂ عظمیٰ، نواب عالم آرا بیگم، اختر محل، نواب اشتیاق محل صاحبہ نواب سلیمان محل، نواب امیر محل، پری محل، عاشق محل، نواب انجم النسا بیگم، عرف انجو بیگم، نواب معشوق محل، سکندر محل، سرفراز محل، نوابِ سلطان، جہاں محل، چنیز محل، ممتاز محل ثانی وغیرہ۔

حقیقت میں حضرت محل بیگم مایۂ ناز اور بہادر خاتون نے قومی تاریخ میں ایسے امنٹ نقوش چھوڑے ہیں کہ تاریخ ان کو مٹا نہیں سکتی اس کے کارنامے ملک و قوم کے لیے مفید ثابت ہوئے بیگم کی وفات قوم کو حیات کا درس دیتی ہے۔

"انھیں چراغوں کے گُل سے جلیں گے کتنے چراغ"

۱۹۳۷ء سے مرحوم مجازؔ نے حضرت محل جیسی خواتین کی زندگی سے متاثر ہو کر ملک کی خواتین کو نصیحت کی ہے کہ:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مولانا شررؔ بیگم حضرت محل کی مستعدی نیک نفسی اور صبر و قناعت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے — جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

صاحب جی

بھارت کی شیر دل خاتون

صاحب جی شاہجہانی عہد کے معروف انجینئر اور زبردست جنرل و عالم فاضل علی مردان خاں کی بلند اختر نیک دختر تھی۔ والد کی تعلیم و تربیت نے صاحب جی کو ہمت اور حوصلہ بخشا۔ صاحب جی کی شادی کے بارے میں مآثر الامراء کا بیان ہے کہ اس کی شادی میراں امیر خاں سے ہوئی۔ یہ زمانہ سخت امتحان اور حوصلہ کا تھا میراں میر خاں اس زمانے میں کابل کا گورنر تھا۔ ایسے نازک دور میں اگر صاحب جی شوہر کا ساتھ نہ دیتی تو وہ اپنے کام میں ناکام رہتے۔ صاحب جی نے کسی بغاوت اور سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔

افغانستان کے اکھڑ مزاج سپاہیوں اور سرکشوں کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیے۔ ۱۱۰۹ھ میں افغانستان میں نت نئے فتنے اور فساد جنم لے رہے تھے چاروں طرف ہنگاموں کے بھونچال اور سازشوں کی سرنگیں دکھائی دیتی تھیں ایسے خطرناک اور ہولناک دور میں صاحب جی نے بڑی عقلمندی، دانشمندی، تدبر اور سیاسی بصیرت سے اپنے شوہر کا ساتھ دے کر تاریخ میں مثال قائم کی وہ ہمیشہ اپنی فوج کی ہمت افزائی کرتی رہتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد جب تمام امراء تعزیت کے لیے صاحب جی کے گھر آئے تو صاحب جی نے سب کو مخاطب ہو کر دلیری کے ساتھ اعلان کیا کہ:

"جو وظیفہ تمھیں ملتا ہے یا جو نذرانہ تم کو دیا جاتا ہے وہ بدستور جاری رہے گا اس لیے بہتر یہی ہے کہ فتنہ انگیزی اور شورش پسندی کا سودائے خام اپنے دماغوں سے نکال ڈالو اور چپ چاپ اپنے علاقوں میں واپس چلے جاؤ اگر تم مجھے ایک کمزور عورت سمجھ کر ملک میں فساد پیدا کرنا چاہتے ہو تو "ہمیں میدان وہمیں چوگان"۔ اگر میں فتحیاب ہو گئی تو

قیامت تک میرا نام مردانگی کی تاریخ میں مہر تاباں کی طرح چمکتا رہے گا اور اس حالت میں تمہیں ندامت کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا اور آنے والی نسلیں تمھیں ننگ خلائق بزدل اور بودے سمجھ کر ہمیشہ نفرت و ملامت سے یاد کیا کریں گی۔

بغرض محال تم کامیاب بھی ہو گئے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی جس کا کام اولاد کی پرورش اور امور خانہ داری کی نگہداشت کے سوا اور کچھ نہیں اور جس پر غلبہ حاصل کرنا کوئی مردانگی نہیں ہے۔[1]

"اس تقریر سے وحشی افغانوں کی گردنیں شرم کے مارے جھک گئیں انھوں نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے اور صاحب جی کے ہاتھ پر تجدید اطاعت کی"۔

صاحب جی نے شوہر کی وفات کے بعد افغانستان میں کسی شورش کو برپا نہیں ہونے دیا۔ میراں امیر خاں کی وفات کے بعد عالمگیر نے شاہ عالم بہادر کو کابل کا گورنر بنا کر بھیجا اور یہ نصیحت سخت ہدایت کے ساتھ بذریعہ فرمان کی گئی کہ ہر کام میں صاحب جی سے مشورہ کر لیا کریں۔ اور جس طرح وہ مشورہ دیں اسی پر عمل کریں"۔

آخر میں کابل سے صاحب جی برہانپور ہوتی ہوئی سورت پہنچی اور وہیں سے بیت اللہ شریف روانہ ہو گئیں بقیہ زندگی مکہ مکرمہ میں بسر کی۔ صاحب جی بہت ہی سخی دل اور فیاض طبیعت خاتون تھی۔ وہاں بھی ہر ہندوستانی کے لیے اس کا دسترخوان کوتاہ نہیں ہوا۔ مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ ایک دن صاحب جی ڈولی میں بیٹھ کر ایک کوچہ سے گذری تو ایک شاہی مست ہاتھی نے اس کی ڈولی کو سونڈ میں لپیٹ کر زمین پر دے ماری جب ہاتھی نے ڈولی کو پاؤں کے تلے روندنے کی پہل کی تو شیر دل خاتونِ عفت بجلی کی طرح سرعت سے تڑپ کر ایک صراف کی دکان میں گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اس طرح بھارت کی اس شیر دل خاتون نے ہاتھی سے اپنی جان کی حفاظت کی۔

---

[1] بحوالہ دختران ہند ص ۲۴۱ - ۲۴۰

بہو بیگم

اودھ کی تاریخ میں بہو بیگم کا نام ممتاز ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے جو مقام تاریخِ تیموریہ میں نورجہاں کو حاصل ہے وہی مقام شاہان اودھ کی تاریخ میں بہو بیگم کو حاصل ہے وہ ایک اعلیٰ دماغ کی حامل تھی۔ ملکی سیاست پر مکمل طور پر حاوی رہی اس کا رعب و دبدبہ اچھے اچھے سرکشوں کے سینوں کو ہلا دیتا تھا۔ وہ بہت ہی شان وشوکت کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ تادمِ حیات حکومت کرتی رہی۔ بہو بیگم کا اصلی نام امتہ الزہرا تھا وہ نواب موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں کی دختر تھی۔ اس کی شادی شجاع الدولہ صفدر جنگ کے بڑے بیٹے سے ہوئی۔ محمد شاہ کی شاہی گود میں اس نے تعلیم و تربیت پائی۔ اس کی شادی سے پہلے ہی اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بڑے بھائی نجم الدولہ نے اسے بیٹی کی طرح پالا اور بڑے دھوم سے بہو بیگم کی شادی کی محمد شاہ نے بھی اسے جہیز دیا۔ تاریخ فرح بخش سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ نے اسے ایک ہزار چاندی کے پیالے عطا کیے اور ایک پیالے کا وزن سو چاندی کے روپیہ کے برابر تھا۔ ایک تولا کھ سالانہ آمدنی کی جاگیر بھی عطا کی شادی میں دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا فیض آباد میں ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا، شجاع الدولہ اس کا بے حد احترام کرتا تھا اور اسے مہرداری کا کام بھی سپرد کر دیا تھا اور ضلع گونڈہ کی قیمتی جاگیر بھی عطا کی اس کے سگے بھائیوں کو اعلیٰ عہدے بھی حاصل ہوئے۔ بیگم بھی اپنے شوہر کو دل و جان سے چاہتی تھی ۱۷۶۴ء جب شجاع الدولہ کو بکسر کی لڑائی میں شکست ہوئی تو بیگم صاحبہ نے اس کی ہر طرح سے مالی امداد کی۔ اس نے کہا کہ اگر نواب زندہ و سلامت ہے تو سب کچھ ہے ورنہ یہ چیزیں میرے کس کام کی ہیں۔ انگریزوں نے بھی بیگم صاحبہ کی فراخ دلی اور شوہر پرستی کی تعریف کی ہے۔ ۱۷۷۵ء میں جب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا آصف الدولہ تخت نشین ہوا تو اب بیگم کی کتاب حیات کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ آصف الدولہ عیش پرست اور عیاش

طبعت نکلا ریاست کی رقم کو ختم کر دیا۔ آصف الدولہ کا کچھ دن کے بعد ہی انتقال ہو گیا۔ پھر بیگم کا سونیلا بیٹا سعادت علی تخت پر بیٹھا۔ اور اس نے بھی بیگم کے خزانے کو لوٹنے کی ٹھان لی ۱۸۱۶ء میں کچھ دن بیمار رہنے کے بعد بیگم کا انتقال ہو گیا بیگم نے ۸۶ سال کی عمر پائی۔ مقبرہ جواہر باغ میں ہے جو فیض آباد سے دو میل کے فاصلے پر ہے

نہایت دین دار نیک خصلت تھی۔ دل کھول کر خیرات کرتی تھی۔ مسٹر آر۔ایچ آرنیو اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ بیگم کے زمانہ میں روپیہ پانی کی طرح بہتا تھا۔ محمد خلیل اسی کے دربار کا خوشنویس تھا جو تحریر کی اٹھارہ طرزیں جانتا تھا اور قدیم مکتوب کی اسی طرح کی نقل کر دیتا تھا۔ اصل اور نقل میں فرق نہیں رہتا۔ مرزا طاہر مہرکن بھی اسی کا درباری تھا۔ وہ غریب پرور یتیم مسکین لڑکیوں کی مددگار ہزاروں بیکس عورتیں پرورش پاتی تھیں، ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت سے مدرسے جاری کیے۔ اس کی زندگی عورتوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔ استطاعت اور طاقت رکھنے کے باوجود اس نے فرائض منصبی کو فراموش نہیں کیا۔

لطف النساء

لطف النساء نواب سراج الدولہ کی غیور بیگم تھی۔ لُطف النساء کا اصلی نام راج کنور تھا۔
راج کنور کا نام بنگال کی معروف خواتین میں مہرِ منور کی طرح روشن ہے بیگم کی زندگی کا زیادہ تر حصہ غم و آلام میں گزرا مگر اپنے صبر و استقلال سے لُطف النساء نے ثابت کر دیا کہ دنیا کی کوئی طاقت عورت کے دل پر نہ قبضہ کر سکتی ہے نہ سخت سے سخت امتحان اس کو متزلزل کر سکتا ہے۔

راج کنور ایک ہندو گھرانے کی چشم و چراغ تھی وہ چھوٹی عمر میں نواب سراج الدولہ کے یہاں جاریہ ملازم ہوئی۔ راج کنور سے پہلے سراج الدولہ کی شادی عمدہ النساء عرف بہو بیگم سے ہو چکی تھی اس کے بعد سراج الدولہ کی شادی راج کنور سے ہوئی اپنے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کی بنا پر راج کنور نے نواب صاحب کے دل پر اپنا اثر جما لیا۔

نواب سراج الدولہ کے والد شجاع الدولہ کو کسی افغان نے ۱۷۴۸ء کو قتل کر دیا اس کے بعد سراج الدولہ کے دادا نواب علی وردی خاں نے ——— کسی وجہ سے بہار کا گورنر راجہ جانکی رام کو بنا دیا اس پر پوتے اور دادا میں اختلاف پیدا ہو گئے مگر لطف النساء نے اپنی دانشمندی سے دونوں کے اختلاف کو ختم کرا دیا۔

کچھ عرصے کے بعد بہو بیگم کے والد محمد ایرج اور میر جعفر سراج الدولہ کے جانی دشمن ہو گئے پلاسی کی جنگ اسی دشمنی کا نتیجہ تھی جس میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ سراج الدولہ لطف النساء کے ساتھ بھگوان گولہ پہنچا اور وہاں سے عظیم آباد کو روانہ ہوا۔ راستہ میں بہرام کے مقام پر دانا شاہ کے مزار پہ کچھ کھانے کی چیز کی تلاش میں پہنچا۔ وہاں میر جعفر کے داماد میر قاسم کو جیسے ہی سراج الدولہ کی خبر ملی فوراً ہی دونوں کو گرفتار کر لیا اور سارا سامان چھین لیا۔ سراج الدولہ کو قتل کر دیا گیا اور لطف النساء کو مرشد آباد میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔

لطف النساء نیک بخت اور پاکباز عورت تھی شوہر کی وفاداری کی مثال تاریخ میں دیکھنے

کو کم ملتی ہے شوہر کی وفات کے بعد بہت سے امراء نے لطف النساء سے شادی کے لیے پیغامات بھیجے مگر غیور عورت نے جواب دیا کہ جو ایک بار ہاتھی کی سواری کر چکا ہو وہ گدھے پر سوار نہیں ہو سکتا۔

وہ ہمیشہ بھاگیرتی ندی کے دائیں کنارے موتی جھیل کے سامنے خوش باغ میں زندگی کے آخری لمحہ تک رہیں نواب سراج الدولہ بھی وہیں مدفون ہیں۔ لطف النساء کی خوش نصیبی کہ شوہر کی دیکھ بھال کرتی رہتی تھی، اس نے قاری اور مولویوں کو قرآن خوانی کے لیے مقرر کر دیا تھا کہ وہ نواب صاحب کے مزار پر قرآن پاک پڑھتے رہیں۔ نومبر ۱۷۹۰ء میں لطف النساء کی وفات ہوئی۔ سراج الدولہ کے بعد ۳۴ سال تک حیات رہیں ایسے دردناک وافلاس ومصیبت کے دور میں بھی اس غیور بیگم کے صبر واستقلال نے اہل عالم کو دکھایا کہ ایک مسلمہ کا اخلاق اور چلن ایسا ہونا چاہیے۔

رضیه سلطان

رضیہ سُلطان

رضیہ سلطان، سلطان شمس الدین التمش کی بلند اختر اور قطب الدین ایبک کی نواسی تھی۔ التمش ایک تاتار رئیس کا جگر تھا مگر انقلاب زمانہ کے ہاتھوں بھائیوں نے اسے بخارا کے شہزادہ کے ہاتھوں بیچ دیا۔ رضیہ سلطان میں اعلیٰ تعلیم و تربیت سے سیاسی بصیرت، اور قابلیت اور عسکری صلاحیت پیدا ہو گئی۔ رضیہ سُلطان کی پیدائش کوشک فیروزی میں ہوئی وہ التمش کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتی تھی وہ بہت ہی ذہین اور ہونہار لڑکی تھی، وہ پہلی مسلمان خاتون تھی جو دہلی کے تخت پر رونق افروز ہوئی۔ التمش رضیہ سلطان کے اوصاف دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ ۶۳۰ھ میں اس کو اپنا جانشین مقرر کیا اور رکن الدین (بھائی) کے بعد ۶۳۴ھ میں تخت پر بیٹھی۔ مسلمانوں کے اعتراض پر التمش نے جواب دیا کہ:

"میرے لڑکے جوانی کی عیاشی میں غرق ہیں اور ان میں سے کوئی بھی سلطان ہونے کے لائق نہیں وہ مُلک کی حکمرانی کے قابل نہیں ہیں اور میری وفات کے بعد آپ دیکھیں گے کہ حکومت کو چلانے میں میری لڑکی سے زیادہ اور کوئی قابل نہیں ہوگا۔"

رضیہ سلطان نے التمش کی زندگی میں ہی حکمرانی کا پورا تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ دور دراز علاقوں میں بھی جنگ کے وقت باپ کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ جب رضیہ خود حاکم بنی تو اس نے بڑی بہادری سے ملتان، لاہور، اور ہانسی وغیرہ کے باغیوں کو دبا دیا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن وزیرِ اعظم محمد جنیدی بھی جان بچا کر بھاگ گیا اس نے عورت کا لباس اتار دیا اور مردوں کے لباس میں ملبوس رہنے لگی، لڑنے کے لیے میدان جنگ میں خود جایا کرتی تھی۔

منہاج الدین سراج جو اس کا ہم عصر مورخ تھا اپنی معروف تصنیف طبقاتِ ناصری

میں رضیہ سلطان کے اوصاف کو یوں تحریر کرتے ہیں کہ :

"وہ ایک عظیم ملکہ، انصاف پسند بہبودئ رعایا کی خواہاں یکساں نیت پسند محافظ رعایا اور اپنی افواج کی کمانڈر تھی"۔

منہاج آگے تحریر کرتے ہیں کہ

"سلطان رضیہ کو خدا نے وہ سب خوبیاں عطا کی تھیں جو شاہانِ عادل اور کامل میں ہوتی ہیں وہ عاقل، عابد، کریم عالم نواز، عدل گستر، رعایا پرور اور بہادر تھی اس میں سوائے عورت ہونے کے اور کوئی نقص نہ تھا اس لیے اس کی صفات گریدہ، نے نفع نہیں پہنچایا"۔

ابو قاسم فرشتہ ملکہ کی تعریف کرتا ہوا کہتا ہے کہ :

"سلطان رضیہ میں صفاتِ جہانداری موجود تھیں عقل فہم حسن و تدبیر وسیاست میں عورت اپنے زمانے کے بہترین مردوں کے ہم پلہ تھیں۔۔۔۔ مذہبی معلومات اور دوسرے علوم وفنون میں بھی اسے اچھی دسترس گاہ حاصل تھی"۔

رضیہ سلطان نے منہاج الدین سراج کو ناصریہ کالج دہلی کا پرنسپل مقرر کیا۔ رضیہ سلطان نے بہت مکاتب اور مدارس جاری کیے وہ علماء کی قدردان اور قرآن پاک کی دلدادہ تھی ہر کام تلاوتِ قرآنِ پاک سے کیا کرتی تھی۔

جس وقت رضیہ سلطان تخت پر بیٹھی تمام حکومت میں ابتری پھیلی ہوئی تھی مگر اپنی قابلیت اور حوصلہ مندی سے رضیہ نے تمام باغیوں پر قابو پالیا۔ اور ملک کو تباہی سے بچالیا۔ اور باغیوں کو آپس میں لڑوا کر ان کی قوت کو پوری طرح ختم کردیا اور رنتھنبور کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ جنیدی باغیوں کی مدد کررہا تھا۔ اس کو مکمل طور سے تباہ کردیا۔ ان دنوں نور ترک جو اسماعیلی عقیدے سے تھا اور قرامطہ اور ملاحدہ فرقہ کا حامی اور حنفی اور شافعی مسلمانوں کا دشمن تھا رضیہ کے زمانے میں پوری طرح ختم ہوگیا اور ملک فتنہ فساد سے پاک ہوا رضیہ نے ہر شورش اور بغاوت کو ختم کرکے ملک میں چاروں طرف امن وامان قائم کیا۔ اس کی دانشمندی اور رعیت نوازی سے

ملک میں خوشحالی نظر آنے لگی اور تجارت نے فروغ پایا۔ اس نے "ترکان چہل گان" (چالیس امیروں کا گروہ) کو ختم کرانے کی کوشش کی۔ اس گروہ کا کام یہ تھا کہ جس کو وہ چاہتے سلطان بنا دیتے اور جس کو چاہتے تخت سے اُتار دیتے تھے۔ یہی گروہ ملک کی سیاست پر اقتدار جمائے ہوئے تھا، چاروں طرف انھوں نے ہی بغاوتیں برپا کرا رکھی تھیں۔ عورت ہونے کی وجہ سے امراء رضیہ سے مخالفت پر تلے ہوئے تھے اس خامی نے ہی رضیہ کے تمام اوصاف کو اس طرح نقاب پوش کر دیا جس طرح ساون کے مہینہ میں سیاہ بادل سورج کی کرنوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ بالفاظ ایک مورخ " ماسوائے عورت ہونے کے اس میں تمام شاہانہ اوصاف تھے اور اس کمی کی وجہ سے مردوں کی آنکھوں میں اس کے تمام اوصاف مفقود ہو گئے "۔ ایک عورت کے تخت پر رہنا اپنی بے غیرتی سمجھتے تھے۔ وہ رسول اکرمؐ کی حدیث سے بھی واقف تھے۔ عورت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

" دنیا میں سب سے بیش قیمت چیز ایک پاک عورت ہے لیکن جو لوگ عورت کو حاکم بنائیں گے انھیں کبھی دل کا سکون نصیب نہیں ہو سکتا "۔

جلد ہی سردار بے چین ہو اُٹھے اور انھوں نے یاقوت نامی ایک حبشی غلام کو داروغۂ اصطبل سے فوجی افسر بنانے پر بغاوت کھڑی کر دی، رضیہ یاقوت پر بہت مہربان تھی۔ امیروں نے اس کے بے پردہ ہو کر دربار میں آنے پر بھی اعتراض کیا۔ اس بنا پر لاہور اور بھٹنڈہ کے صوبیداروں نے بھی بغاوت کر دی۔

رضیہ سُلطان اختیارالدین التونیہ (والئے بھٹنڈہ) کی بغاوت کو دبانے کے لیے بھٹنڈہ پہنچی تو رضیہ سُلطان کو وہاں قید کر لیا لیکن رضیہ سلطان نے وہاں دوراندیشی اور دانشوری سے کام لیا اور اختیارالدین سے شادی کر لی۔ باغیوں نے پہلے ہی رضیہ سلطان کے بھائی بہرام شاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا تھا حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے رضیہ بیگم التونیہ کے ساتھ دہلی کی جانب بڑھی۔ لیکن اس کی فوج کو بُری طرح شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ جب رضیہ نے اپنے خاوند کے ساتھ وہاں سے فرار ہونا چاہا تو باغیوں نے ان کو پکڑ لیا اور ۱۲۴۰ء میں دونوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس طرح رضیہ سلطان نے تین سال چھ دن حکومت کی۔

"مسلمانوں کے عہد کی پہلی ملکہ رضیہ سلطان بادشاہ بنی۔ یہ شہزادی غنچہ دہن، گلبدن، ماہ طلعت خورشید تھی۔ حسن ظاہری کے علاوہ نہایت ذہین اور فہم رس تھی، شہزادی کے گھوڑے کی سواری دیکھ کر شہسوار حیران رہ جاتے تھے۔ قطب مینار پر جو الفاظ کندہ ہیں وہ اسی عالی دماغ عورت کی قابلیت کا نمونہ ہے۔"

پدمنی

رانی پدمنی

پدمنی میواڑ کے راجہ رتن سنگھ کی رانی تھی۔ (چتوڑ) . جو راجپوتانہ میں واقع ہے یہاں کے لوگ بہت بہادر ہوتے ہیں۔ راجہ رتن سنگھ تیرہویں صدی کے آخر میں میواڑ کا حکمراں تھا پدمنی ــــ راجہ امر سنگھ چوہان کی چہیتی بیٹی تھی۔ "ہندوستان کی بہادر عورتیں کتاب کے مصنف کا بیان ہے کہ پدمنی ایک کھلے ہوئے کنول کے مانند خوبصورت تھی اس کا نام خود ہی اس کے حسن کی دلیل ہے" اس زمانے کے کویوں اور شاعروں کا خیال ہے کہ رانی پدمنی کے حسن و جمال کی تعریف کرنا محال ہے۔ آنکھیں ستاروں کو ماند کر دیتی ہیں بدن گلاب سے زیادہ نازک دانت موتیوں سے زیادہ شفاف اور آبدار تھے۔ اس کے ہونٹ یاقوت کو مات کرتے تھے اس کی سبک خرامی لوگوں کے دلوں کو پامال کر دیتی تھی۔ رانی پدمنی میں رحم دلی اور خدا ترسی بھی بے حد تھی۔

رانی پدمنی کے حسن و جمال کی داستان سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جب تک چاند سورج باقی ہیں پدمنی کا نام آسمانِ مردانگی پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکتا رہے گا اس رمز شناس خاتون کے حسن و جمال نے سب حسیناؤں کی شمع حسن کو بے نور کر دیا تھا۔

"حقیقت میں رانی پدمنی چتوڑ کا مہتاب چودھویں رات کا چاند کو دن مہر نیم روز تھی"۔ جب سلطان علاؤالدین خلجی نے چتوڑ پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ کے دوران رانی قلعہ کی فصیل پر جنگ کا نقشہ دیکھ رہی تھی۔ اس جنگ میں جب راجہ رتن سنگھ مارا گیا تو علاؤالدین خلجی نے قلعہ پر قبضہ کے بعد رانی پدمنی کو حاصل کرنا چاہا۔[1] پدمنی سلطان کے لوگوں کی نیت کو

---

[1] ڈاکٹر جی ایچ اوجھا، ڈاکٹر کے۔ ایس لال اور خواجہ امیر خسرو نے سلطان علاؤالدین اور پدمنی کے واقعہ کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ دیگر مورخ بھی اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ اس کو صرف ملک محمد جائسی نے ہی پدماوت میں ہی تحریر کیا ہے جو خیالی ہے۔

سمجھ گئی تورانی نے اپنی عورتوں سے کہا کہ اب جینا حرام ہے بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے آؤ ہم بھی چتوڑ کی تاریخ میں اپنا نام کر جائیں ؟"

رانی کی اس تقریر کا وہاں کی عورتوں پر بہت اثر ہوا، رانی نے پھر کہا "تم میں سے جس کو عزت سے جان پیاری ہو وہ میرے ساتھ نہ آئے پیچھے ہی ٹھہر جائے۔ سب عورتوں نے رانی کا ساتھ دیا دیکھتے ہی دیکھتے پھول سے نازک جسم شعلوں کی نذر ہو گئے۔ اس طرح راجپوت عورتوں نے ستی[1] ہونے کی رسم کو ادا کیا۔

جب سلطان قلعہ کے اندر داخل ہوا تو اسے وہاں آگ کے شعلوں اور راکھ کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں پایا سلطان کو یہ منظر دیکھ بڑی حیرت ہوئی۔ آج بھی ہندوستان کی غیرت مند اور بہادر خواتین کی تاریخ میں پدمنی کا نام سنہرے لفظوں میں لکھا ملتا ہے۔

[1] ستی : مخصوص حالات کے پیش نظر ایک ہندو بیوی کو اس کے شوہر کی موت کے بعد جلانا رسم ستی کہلاتی ہے (شاہ ص ۱۳۰) وہ عورت جو خود کو آگ کے سپرد کرتی تھی ستی کہلاتی تھی۔ ستی ہونے کا یہ ناگوار فرض دو طرفہ نہ تھا صرف عورت ہی کو ستی ہونا پڑتا تھا۔ یہ رواج صرف اعلیٰ طبقہ تک محدود نہ تھا۔ ادنیٰ طبقہ میں عورتیں صرف اپنے شوہر کی ارتھی کے ساتھ مکان کی دہلیز تک ہی رہتی تھیں۔ جدید زمانہ میں اس خیال کی تائید کے لیے دیکھیے ستی از کما راسوامی ص ۸ مصنف کا خیال ہے: "انسانی روح مرد اور عورت سے دو قسم کی عقیدت کا تقاضا کرتی ہے عورت مرد سے عقیدت رکھے اور مرد اپنے خیالات سے۔"

تھامپسن اپنی تصنیف کے ص نمبر ۱۹ پر تحریر کرتے ہیں: کہ "سکندر کے سپاہیوں نے ستی کی رسم کو پنجاب میں پایا۔"

عورت کو شوہر کے مردہ جسم کے ہمراہ اور اس کے بغیر دونوں طرح ستی کرنے کا رواج تھا اگر مرحوم

سلطان نے رانی کے محل کو بالکل محفوظ چھوڑ دیا جو آج تک جھیل کے کنارے اس جاں باز رانی کی یاد میں آنسو بہا رہا ہے۔

رانی تارا بائی:-

رانی تارا بائی جیسی بہادر خاتون کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ تارا بائی راجہ رام جو مرہٹہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تارا بائی اسی کی رانی تھی۔

شوہر کی لاش مہیا ہو جاتی تھی تو بیوی کو اس کے ہمراہ جلا دیا جاتا تھا۔ اسے سہ مرن یعنی ساتھ مرنا کہا جاتا تھا اور اگر شوہر بیوی سے دور مرتا یا اگر بیوی حاملہ ہوتی تو بعد میں بیوہ کو ایسی چیز کے ساتھ جلایا جاتا جس کا تعلق اس کے شوہر سے تھا یا اس کے شوہر کی نشانی ہوتی تھی اس جلنے کو انو مرن یعنی قاعدہ کے مطابق مرنا کہا جاتا تھا ——— متعدد بیویوں میں یہ حق صرف چہیتی بیوی کو ہی تھا کہ جب اسے جلایا جانے تو اس کی گردن اس کے شوہر کے بازو پر رکھی ہو، اگر کسی کی ایک بیوی سے زائد ہوتی تھیں تو شوہر کے ساتھ بڑی بیوی کو ستی ہونا پڑتا تھا اور دوسری بیویوں کو الگ الگ جلایا جاتا تھا۔ اس وقت بیویاں اپنے آپسی اختلافات کو اور عداوت کو بھلا دیتی تھیں جیسا کہ چتوڑ کے راجہ رتن سین کی بیویوں نے کیا تھا۔ دونوں ہی بیویاں اپنے شوہر کی لاش کے دونوں طرف انتہائی دوستانہ طریقہ سے بیٹھ گئیں اور خاموشی سے شعلوں کی نذر کر دیا۔

محترم ڈاکٹر کے۔ ایم اشرف معروف تصنیف " ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ کے ص ۲۵۲ پر لکھتے ہیں کہ کسی بیوی کا شوہر کی لاش کے ساتھ جلنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا بیان بہت تکلیف دہ ہے اسے صرف تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم چند مثالیں ابن بطوطہ سے تحریر کرتے ہیں الرحلہ

"راجہ رام مغلوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اپنے شوہر کے قتل کے بعد رانی تارا بائی نے مغلوں کا بہادری سے مقابلہ کیا اور اپنی سلطنت کی مرتے دم تک حفاظت کرتی رہی وہ ملکی نظام میں پوری صلاحیت اور قابلیت رکھتی تھی وہ سپہ گری اور فنونِ جنگ سے بخوبی واقف تھی۔

کچھ مصنفین کا خیال ہے کہ تارا بائی نے صرف اپنے بیٹے کے لیے کام کیا اس نے نہ کوئی کام ملک کے لیے کیا نہ قوم کے لیے اس لیے اس کا شمار ہندوستان کی بہادر خواتین میں نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن جس دور بینی اور دور اندیشی اور دانشمندی سے تارا بائی نے کام کیا۔ اس کو دیکھتے ہوئے نار بخ کا فیصلہ یہی ہے کہ تارا بائی کا نام ملک کی نامور بہادر خواتین میں ضرور ہونا چاہیے۔ اس لیے تارا بائی کا نام دخترانِ ہند کی جاں باز خواتین کے نام الگ رکھنا زیادتی ہوگی۔

میں بطوطہ نے دونوں قسم کے واقعات کی تفصیل دی ہے۔ شوہر جب دور و دراز جنگ میں شہید ہوتا تو یہ خبر سُن کر بیوی غسل کرتی، بہترین کپڑے اور زیورات سے زیب تن ہوتی جلد ہی ایک جلوس میں شمشان گھاٹ کی طرف لے جایا جاتا برہمن ہمراہ چلتے ہوئے مستقبل کی زندگی پر اسے مبارکباد دیتے عورت دائیں ہاتھ میں ایک کھوپرا اور بائیں ہاتھ میں ایک آئینہ لے کر گھوڑے پر سوار ہو جاتی جلوس سایہ دار درختوں کے جھنڈ کی طرف گانے اور باجے ـــــــــــ کے ساتھ روانہ ہوتا اور اس جھنڈ میں پانی کا تالاب اور پتھر کی ایک مورتی غالباً یہ مورتی شوہر کی ہوتی تھی تالاب کے قریب آگ جلتی اسپر منا واتر تل کا تیل ڈالا جاتا یہ آگ عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی پورا ماحول دوزخ کا منظر پیش کرتا تھا۔ خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ سایہ دار جھنڈ میں پہنچ کر عورت تالاب کے پانی میں نہاتی اور تب اپنے عمدہ کپڑوں اور زیورات کو

تارا بائی مرہٹہ سردار ہمیر راؤ (سورسین) کی لاڈلی بیٹی تھی اور سیواجی کے دوسرے بیٹے راجہ رام کی بیوی تھی، تارا بائی نے بھی اپنے بیٹے کا نام دادا کے نام پر ہی شیواجی رکھا، یہ دور مرہٹوں اور مغلوں کی جنگ کا خوفناک دور تھا، مرہٹوں کی مغلوں کے سامنے برابر شکست ہو رہی تھی۔ راجہ رام ایک بار شکست کھا کر دکن کی طرف بھاگ گیا وہاں سے وہ جنجی مقام پر پہنچا اور وہیں تارا بائی کو بھی بلا لیا۔ مغلوں نے اس مقام کو بھی گھیر لیا پھر راجہ رام مہاراشٹر پہنچا اور وہیں ۱۷۰۰ء میں وفات پائی۔ امبکا بائی جو راجہ رام کی پہلی بیوی تھی، راجہ رام کے ساتھ ہی ستی ہو گئی، اب تارا بائی کو مصیبتوں نے گھیر لیا۔ مگر زندگی کے آخری لمحوں تک تارا بائی نے ہمت نہیں ہاری اور مغلوں کی فوج نے طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کر دیا وہ پہاڑوں

ایک ایک کر کے سپرد آتش کرتی۔ آخر میں وہ کسی سے ایک بغیر سلا کپڑا مانگ کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیتی اور بہت ثابت قدمی اور حرارت کے ساتھ آگ کی طرف قدم بڑھاتی جو ابھی تک اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھی وہ ہاتھ جوڑ کر اگنی دیوی سے دعا کرتی تھوڑی دیر خاموشی سے عبادت کرتی اور تب اچانک غیر متزلزل ارادے کے ساتھ خود کو شعلوں کے سپرد کر دیتی، ٹھیک اسی وقت دوسری طرف سے ڈھول تاشوں کا شور بلند ہوتا جس کا مقصد واضح طور پر خوفناک منظر سے لوگوں کی توجہ ہٹانا ہوتا تھا۔ دوسرے افراد جو ستی کی حرکات کو بغور قریب سے دیکھتے رہتے تھے۔ جلتی ہوئی صورت کے جسم پر لکڑی کے وزنی ٹکڑے ڈال دیتے تاکہ وہ اس سے نکل نہ سکے یا نکلنے کی جدوجہد نہ کر سکے۔ ابن بطوطہ اس منظر کی تاب نہ لا کر غش کھا گیا۔ اسے لوگوں نے وہاں سے ہٹایا اس لیے اس کا بیان مزید تفصیلات مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ ستی کی رسم میں جو واقعات ہوتے تھے۔ یہ اس کا کم و بیش صحیح اور مکمل نقشہ ہے

(ابن بطوطہ ج دوم الرحلہ ص ۳ - ۴)

میں گھس جاتی اور کہیں سے کہیں نکل جاتی تھی، مغل فوج سے کئی بار بچ بچ کر لڑتی لڑتی جنگلوں میں جا چھپی۔ آخر میں فرخ سیر کی فوج نے اسے پکڑ لیا اور اس کی قوت کو ہمیشہ کے لیے توڑ دیا۔ تارا بائی کے کارنامے صرف تاخت و تاراج تک محدود ہیں تاہم اسے تاریخی شہرت حاصل ہے۔

کچھ مصنفین نے تارا بائی کے کاموں کو ڈاکوؤں، رہزنوں، قزاقوں اور فرقانہ نام سے پکارا ہے۔ اتنا ضرور ماننا پڑتا ہے کہ تارا بائی کے پہلو میں وہ دل تھا کہ شیروں میں بھی میسر نہیں ہوتا۔ تارا بائی بہت ہی حسین اور نازک کامنی مورت

دیگر ذرائع سے جو معلومات ہم تک حاصل ہوئیں ہیں ان سے ابن بطوطہ کے بیان کردہ حالات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ستی کی رسم میں مذہبی عنصر اور برہمن کی فصیح ترغیب کو بھی بڑا دخل ہے ..... برہمن اسے یقین دلاتا تھا کہ ایک بار جلنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ رہے گی۔ اور اپنے شوہر کے ساتھ دائمی رفاقت ملے گی (کو لوکونٹی (۱۳) صد ۱۳۱)۔ اگر اس نے اس کے برخلاف کیا تو اس کا غیر مطمئن بھوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ارواحِ خبیثہ میں شامل ہو جائے گا۔ لہٰذا بیوہ کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ عام لوگوں کے لیے بیوہ کا ستی ہونا ایک تفریح کی حیثیت رکھتا تھا۔ (تاریخ داؤدی) دیگر تجربہ کار اور دور اندیش افراد ستی ہونے والی بیوہ کو دوسری دنیا میں جانے والے قاصد کی حیثیت سے تصور کرتے تھے۔ وہ لوگ ستی کے ذریعے دوسری دنیا کے باشندوں کے نام ہر طرح کے پیغامات بھجوایا کرتے تھے۔

ستی کی ابتلا سے فرار کی صورت میں عورت کو تلخ اور شرمناک زندگی گزارنی پڑتی تھی، اس لیے وہ سماجی وقار اور مذہبی اعتقادات کی پاسبانی اور اپنی پاک دامنی کی خاطر

خاتون تھی۔ نشانہ بازی کا یہ عالم تھا کہ تلوار مار کر لیمو کے برابر دو ٹکڑے کر دیتی تھی یہ فولاد جگر عورت گھڑ سواری کی شائق تھی مورخین کا بیان یہ ہے کہ تارا بائی شوہر کے ساتھ ہی بڑے استقلال کے ساتھ اس کا سر گود میں لے کر چتا میں بیٹھ گئی اور دونوں جل کر خاک ہو گئے مگر بیان زیادہ معتبر معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ شوہر کے ساتھ بڑی بیوی ہی ستی ہوتی تھی۔

اپنے آپ کو شعلوں کی نذر کر دیتی تھی۔ یہ عورت کی اعلیٰ ترین قابلِ تعریف صفت تھی۔ معاشی دباؤ اور عورت کی پسماندہ حالت بھی ستی کے رواج کے اسباب ہیں۔ ابوالفضل نے اپنی معروف تصنیف آئینِ اکبری میں ستی کی اقسام کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۱۔ اس میں عورت کے رشتہ دار اس کو چتا میں جانے کے لیے مجبور کرتے تھے۔

۲۔ اس میں عورت خود اپنی مرضی سے شوہر کے ساتھ انتہائی محبت کے ساتھ اپنے کو فنا کر لیتی تھی۔

۳۔ تیسری قسم میں عورتیں رائے عامہ کے ساتھ اپنے کو شعلوں کے سپرد کر دیتی تھیں۔

۴۔ چوتھی قسم میں وہ عورتیں تھیں جو خاندانی رسم کے مطابق ستی ہو جاتی تھیں۔

۵۔ پانچویں قسم ان عورتوں کی تھی جنھیں ان کی مرضی کے خلاف آگ میں ڈالا جاتا تھا۔

خواجہ امیر خسرو کی قرآن السعدین، تاریخ مشتاقی نکولو کونٹی ٹوڈ وغیرہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ان کتابوں میں ستی اور جوہر کے سچے واقعات تحریر ہیں۔

جوہر:۔ جوہر کی رسم کم و بیش راجپوتوں تک ہی محدود تھی جب کسی راجپوت سردار کو اور اس کے ساتھیوں میں کسی کو جنگ میں فتح کی امید ختم ہو جاتی تو وہ عام طور پر یا تو اپنی عورتوں اور بچّوں کو قتل کر دیتے یا انھیں کسی زمین دوز عمارت میں بند کر کے اس میں آگ لگا دیتے تھے۔ راجپوت میدانِ جنگ میں مغلوب ہونا یا شکست پر رضامند ہونا نہیں جانتے تھے۔ وہ یا تو جنگ میں فتح پاتے یا فنا ہو جاتے تھے۔

خواجہ امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں رنتھمبور کی جنگ میں چوہان ہمیر دیو اور

رانی روپ متی

رانی روپ متی اپنے عہد کی حُسن کی دیوی کے نام سے پکاری جاتی تھی اور اس کے حسن کی تعریف تمام بھارت میں پھیل گئی تھی رانی روپ متی کا تعلق اعلیٰ بہادر گھرانہ سے تھا۔ روپ متی کے حسن و جمال میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو پدمنی میں پائی جاتی تھیں۔ پدمنی حسن و جمال کی پری کہلاتی تھی۔ رانی روپ متی بھی حسن و جمال کی جیتی جاگتی تصویر تھی جس کی تعریف ہر کوی اور شاعر نے کی ہے اور روپ متی کے بارے میں بڑے بڑے راگ گائے ہیں اور گاتے رہیں گے۔ روپ متی مالوہ کے راجہ کی رانی تھی رانی روپ متی نے احمد آباد میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔

رانی پاربتی

راجہ جھابر سنگھ دیو جو راجہ نرسنگھ بندیلہ کا بیٹا تھا اس کی شادی رانی

علاؤالدین خلجی کے واقعہ کو بیان کیا ہے جس میں علاؤالدین خلجی کو فتح حاصل ہوئی اور راجہ ہمیر نے جوہر کیا ابن بطوطہ نے کمپلا کے راجہ اور محمد بن تغلق کا بھی اسی طرح کا واقعہ تحریر کیا ہے۔ بابر نے اپنی تزک میں راجہ مدنی رائے کی جوہر کی تفصیل بیان کی ہے کہ اپنی شکست کے بعد راجہ مدنی رائے ——— اور اس کے سپاہیوں نے اپنے تمام بچوں اور عورتوں کو قتل کیا۔ وہ خود آخری دم تک لڑتے رہے اور آخر کار سب کے سب قربان ہوگئے۔ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ جنگی قیدیوں اور زخمیوں کے ساتھ برتاؤ فاتح کی مرضی پر تھا اور اس کا کوئی معاہدہ یا دستور نہ تھا۔

رسم جوہر کی زیادہ تر مثالیں شمالی ہند میں پائی گئیں ہیں۔ دکن میں اس رسم کو فروغ نہ مل سکا۔

پاربتی سے ہوئی تھی۔ راجہ جھابر کی اس محبوب بیوی کے حسن وجمال کی تعریف میں کتابیں بھری پڑی ہیں، راجہ نرسنگھ شہنشاہ جہانگیر کا درباری اور باوفادار اور جانثار وفادار آدمی تھا۔

رانی درگاوتی

گونڈوانہ ریاست جو پہاڑی علاقہ میں واقع ہے اور جس کی راجدھانی گڑھ تھی، وہاں کا راجہ دلپت سنگھ تھا۔ راجہ دلپت سنگھ بہت ہی بہادر اور راجپوتوں کا سردار بھی تھا۔ درگاوتی اسی کی رانی تھی، رانی درگاوتی بھی معروف بہادر راجپوت راجہ کی بیٹی تھی۔ درگاوتی کے شوہر کا جوانی میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ راجہ دلپت سنگھ کی وفات کے وقت درگاوتی کی گود میں شیرخوار بچہ تھا اسی لیے درگاوتی رسم جوہر سے بچی رہی۔ راجہ دلپت سنگھ کی موت کے بعد اب ـــــ شیرخوار بچّہ کی پرورش اور ملکی نظام کی ساری ذمہ داری درگاوتی پر آگئی۔ رانی کو سپہ سالار بھی بنایا گیا۔

گونڈوانہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے مغلوں نے آصف خاں کی سالاری میں درگاوتی پر حملہ کے لیے ایک فوج روانہ کی گونڈوانہ پہنچ کر آصف خاں نے حملہ سے پہلے درگاوتی کے پاس مغلوں کی اطاعت قبول کرنے کے لیے پیغام بھیجا جس میں پیامبر نے کہا کہ " غیرت دار شریف رانی میں آصف خاں کی طرف سے آیا ہوں جو اکبرِ اعظم کا سپہ سالار ہے یہ پیام گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ مغل نہ تو آپ سے لڑنے کے لیے تیار ہیں اور نہ آپ کو نقصان پہنچانے کی نیت سے آئے ہیں، اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ اپنے لڑکے کو شہنشاہ کے سپرد کر دیجیے اور مغل بادشاہ کو اپنا مہاراج تسلیم کر لیجیے پھر ساری فوج واپس چلی جائے گی اور آپ کا راج پاٹ برقرار رہے گا۔

یہ پیغام سن کر رانی غصہ میں آگئی اور اس شرط کو نامنظور کرتے ہوئے

بولی کہ " فیصلہ اب میدان میں ہوگا۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوگئی رانی اور اس کے سپاہی بہت بہادری سے لڑے اور کامیابی حاصل کی اس جنگ کے بعد دوسری بار پھر دونوں فوجوں کا میدان میں آمنا سامنا ہوا مگر دوسری بار بھی رانی درگاوتی نے جنگ جیت لی۔ اب آصف خاں کو بہت شرمندگی ہونے لگی، مارے غیرت کے انتقام کی ہزار تدبیریں سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ کیوں کہ درگاوتی نے مغل فوج کے سورماؤں کے دل دہلا دیئے، تمام دن کشت خوں کی لڑائی میں یہ بہادر رانی اپنے حوصلہ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی کیوں کہ وہ فنونِ جنگ میں مہارت رکھتی تھی۔ دوسری جنگ کے بعد بدنصیب رانی نے جوش و خروش میں آکر اس بار اپنے سگے بیٹے ' دریر نارائن ' کو فوج کا افسر بنا دیا۔ اس بات سے راجپوت افسروں میں حسد کی بنا پر آپس میں پھوٹ پڑگئی اور حاسد فوجی اب دشمن کی فوج سے خفیہ ساز باز رکھنے لگے اور خفیہ خطوط بھی لکھے جانے لگے اب درگاوتی تنہا رہ گئی حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔ آصف خاں موقع کی تلاش میں بیٹھا تھا۔ تیسرا حملہ درگاوتی پر کر دیا اس لڑائی میں درگاوتی کا بیٹا دیر نارائن مارا گیا۔ اس حادثہ سے رانی کے ہوش خطا کرنے لگے وہ تیش میں آکر فوج کے جھرمٹ میں گھس کر دشمن پر وار کرتی رہی، اچانک رانی کی آنکھ میں تیر بیٹھ گیا تیر نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ دشمن کے سپاہی نے رانی کے سینہ میں خنجر (بھالا) گھوپ دیا، جس سے وہ تاب نہ لاسکی اور بے ہوش زمین پر گر پڑی۔ اس طرح آصف خاں کو کامیابی ملی۔

اس طرح رانی درگاوتی نے ملک اور قوم کے لیے اپنے کو قربان کر دیا۔ اور تاریخ کی کتابوں کے صفحوں میں اپنی جاں نثاری کی داستان چھوڑ گئی۔

رانی مرگ نینی

مرگ نینی گجرات کے شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی وہ بہت ہی حسین و

جمیل خاتون تھی، اس کی آنکھیں آہو مثال تھیں، اسی لیے اس کو مرگ نینی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ گجرات کے راجہ مان سنگھ کی رانیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت رانی تھی اسی لیے راجہ اس سے بہت زیادہ پیار کرتا تھا۔ افسوس کہ مرگ نینی کے والدین کے حالات کے بارے میں مورخین خاموش ہیں۔

مرگ نینی تعلیم وتربیت سے آراستہ تھی اور شمشیر زنی۔ تیر اندازی۔ گھڑسواری میں مکمّل مہارت رکھتی تھی وہ بہت ہی نیک سیرت رانی تھی اور صورت کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ "اندھیرے میں بیٹھ جائے تو اُجالا ہو جائے۔ رانی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے علم موسیقی میں کمال حاصل تھا جس وقت وہ گاتی تھی انسان تو کیا حیوان اور پرندے بھی مبہوت ہو جاتے تھے، تان سین اس زمانے یعنی اکبری عہد کا عالمی شہرت کا راگ داں اور ساز نواز تھا۔ اس زمانے میں تان سین سے بڑا اور کوئی موسیقار نہیں تھا۔ تان سین پہلے برہمن تھا اور وہ بعد میں اپنی مرضی کے مطابق مسلمان ہوگیا تھا، اس کے گرو معروف موسیقار سادھو مہری تھے۔

"تان سین نے جب مرگ نینی کے گانے اور آواز کی تعریف سنی تو رانی کی خدمت میں حاضر ہوا، رانی سے جب گانا سُنا تو تصویرِ حیرت بن گیا اور اپنی باقی ماندہ زندگی تان سین نے گوالیار میں ہی گذار دی۔ تان سین کی قبر گوالیار کے قلعہ میں اب بھی موجود ہے[1]

مصنّف آگے تحریر کرتا ہے کہ مرگ نینی نے اپنے راگ کے ذریعہ کئی لا علاج مریضوں کو ٹھیک کیا اور رانی کا یہی دعویٰ تھا۔ موسیقی کے ذریعہ لا علاج مریض بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں، رانی نے اپنے راگ کے ذریعہ گجرات کے رہنے والے اپنے ایک عزیز اور ایک مجبور بوڑھی عورت کے لڑکے کا علاج کیا تھا۔

---

[1] بحوالہ۔ رانیاں اور شہزادیاں۔ از خان محمد حسین خاں صہ ۱۹۸

رانی میرا بائی

میرا بائی کا نام ہند کی مایۂ ناز خواتین میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ پاک دامن مقدّس اور نیک سیرت خاتون ہر وقت بھگوان کرشن کی عقیدت میں ڈوبی رہتی تھی۔ اسی لیے اس کو پرم بھگتنی کے نام سے تاریخ ہند یاد کرتی ہے۔

میرا بائی راجہ جیمل کی چہیتی اور لاڈلی بیٹی تھی جو مارواڑ کے معروف راجہ تھے۔ میرا بائی کی زندگی پر اس کی والدہ جو بہت ہی مذہبی خیال کی خاتون پر اس کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے بچپن سے ہی اس کی والدہ مذہبی رسومات میں میرا بائی کو اپنے ساتھ رکھتی تھی جس کی وجہ سے میرا بائی دنیا کے ہر عیش و آرام سے بے نیاز ہوتی چلی گئی۔ میرا بائی ہر وقت کرشن پوجا میں ڈوبی رہتی تھی اور یہ ہی پوجا اس کی زندگی کا مقصدِ حیات بن گیا، دھیرے دھیرے وہ اپنے عہد کی ایک عظیم فقیرہ بن گئی۔ اب دنیا کی اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی ہر وقت اس کی زبان پر یہی راگ کہ:

"مائی موکو سوپن میں ہرنی گوپال"

میرا بائی کا یہ راگ تمام ملک میں مشہور ہو گیا۔ ہزار کوششوں کے بعد بھی دنیا کا کوئی عیش و آرام اس کو اپنی طرف نہ لا سکا۔ میرا بائی جب جوان ہوئی تو رانا کنبھ ابھوج راج یعنی رانا سانگا کے بڑے بیٹے) سے اس کی شادی کر دی گئی۔ شوہر کی بھی ہر کوشش اس کو دنیا کی طرف لانے میں ناکام رہی، آخر میں شوہر کو میرا بائی سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگنی پڑی۔

ایک مرتبہ میرا جب ایک مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی تو رانا کنبھ فقیروں کے لباس میں میرا کی خدمت میں پہنچا اور کہا "مجھے بھی کچھ دو" میرا نے جواب دیا مہاتما میں تو خود فقیر ہوں تم کو میں کیا دے سکتی ہوں، رانا نے معافی مانگی دونوں کچھ دیر تک روتے رہے آخر میں رانا نے کہا کہ تم گھر چلو اس نے منظور کر لیا پھر

دم ینتی

کبھی رانا نے میرابائی کے کام میں دخل اندازی نہیں کی۔ میرا ہر وقت بھجن گاتی رہتی تھی اور گاتے گاتے بے ہوش ہوجاتی تھی، ایک روز وہ روحانی باغ کی کوئل "حقانی راگ" گاتی اڑ گئی۔

(رانی) نیل دیوی

نیل دیوی پنجاب کے راجہ سورج دیو کی رانی تھی، اسے قدرت نے فیاض ہاتھوں سے نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ جب عبدالشریف سور شاہ دہلی کے سپہ سالار نے پنجاب پر حملہ کرکے راجہ سورج دیو کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سپہ سالار دہلی نے نیل دیوی کے ذوقِ موسیقی اور سریلی آواز کے بارے میں بہت شہرت سُنی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ نیل دیوی کی آواز میں جادو کا اثر تھا۔

راجہ سورج دیو کی موت کے بعد سپہ سالار نے نیل دیوی سے اس کا گانا سننے کے لیے بار بار خواہش ظاہر کی تو رانی نے خنجر سے عبدالشریف کا سرتن سے جُدا کر دیا اور خود بھی ہزار داستان سُناتے ہوئے خاک کا ڈھیر ہوگئی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی وہ خاموش ہے لیکن زمانہ اب تک اس کے گیت گا رہا ہے[1]۔

(رانی) دمینتی

دوآبہ دیس پہلے برار کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ دمینتی دوآبہ دیس کے راجہ بھیم کی خوبصورت بیٹی تھی۔ دمینتی "پرستان" کی پری کے نام

[1] بحوالہ:۔ رانیاں اور شہزادیاں، از: خاں محمد حسین خاں صاحب

سے مشہور تھی۔ دمینتی کی شادی نل سے ہوئی تھی۔ دمینتی تاریخ میں اپنی پاکدامنی کے لیے مشہور تھی۔

ایک دفعہ دمینتی اور اس کے شوہر نل کو مصائب کی گھٹاؤں نے گھیر لیا اور گردشِ دوراں نے ایسا امتحان لیا کہ شوہر اور بیوی دونوں ہی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور تین سال تک الگ الگ بھٹکتے پھرے مگر اس عفت مآب وطن کی پاکدامن خاتون نے اپنے دامن پر کوئی داغ نہیں آنے دیا۔ اور اس دوران تقدس اور پاکیزگی کے ساتھ زندگی بسر کی۔

مآخذ

نمبر شمار	نام کتاب	مصنّف	اشاعت
۱	تاریخ جہانگیر	ڈاکٹر بینی پرشاد	ترقی اردو بورڈ نئی دہلی
۲۔	تاریخِ شاہجہانی	ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ	〃
۳۔	حیاتِ نورجہاں	نواب عماد نواز جنگ	مصطفائی پریس لاہور
۴۔	شہزادہ بابر	احمد جان	اردو اخبار پریس لاہور
۵۔	زیب النساء بیگم	مولانا شبلی	نول کشور پریس، لاہور
۶۔	سوانح زیب النساء بیگم	مولوی عاشق حسین	ابوالعلائی پریس آگرہ
۷۔	حیاتُ النساء	منشی محمد دین خلیق	اخبار پریس، لاہور
۸۔	گلبدن بیگم	سعیدالدین حسن شارق	فاروقی پریس، دہلی
۹۔	ہمایوں نامہ (گلبدن بیگم)	مترجم، عثمان حیدر مرزا	مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ
۱۰	گلبدن بیگم	سعیدالدین حسن، بی اے	خواجہ پریس، دہلی
۱۱۔	دخترانِ ہند	مولانا محمد علم الدین سالک	امرت پریس، لاہور
۱۲۔	تذکرہ نسواں ہند	اخبار وطن	〃
۱۳۔	شاہانِ مغلیہ کی بیویاں اور ہندو رانیاں	مراد مارہروی	حیدریہ پریس، دہلی
۱۴۔	زیب النساء بیگم	امراؤ مرزا حیرت	ہبور پریس، دہلی
۱۵۔	جہاں آرا بیگم	مولوی محبوب الرحمٰن کلیم	فیض عام اردو ہند پریس علی گڑھ
۱۶۔	بیگماتِ خاندانِ تیموریہ	سید ظہور الحسن	قومی پریس، دہلی
۱۷۔	نورجہاں	مرزا حیرت علی دہلوی	صدیقی پریس، دہلی

۱۸۔	ہندوستان کی بہادر عورتیں	ایوان اشاعت گورکھپور	ملت پریس گورکھپور
۱۹۔	آبِ حیات	محمد حسین آزاد (احتشام حسین)	بڑی پریس، دہلی
۲۰۔	بزمِ تیموریہ	سید صباح الدین	معروف پریس، اعظم گڑھ
۲۱۔	عالمِ نسواں	راشد الخیری	محبوب پریس، دہلی
۲۲۔	آثار الصنادید	سرسید احمد خاں	نول کشور پریس لکھنو
۲۳۔	الرحلہ	ابن بطوطہ (اردو ترجمہ	مولوی محمد حسین، لاہور
۲۴۔	مطلع الانوار اور	خواجہ امیر خسرو	پرنٹنگ پریس علی گڑھ
	عجائب الاسفار	؍؍	؍؍
۲۵۔	اسلامی نظام اور عورت کا مقام	مائل خیرآبادی	مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
۲۶۔	اقبال نامہ جہانگیری	ذکریا مائل محمد	سمتا پریس لکھنؤ
۲۷۔	شہزادی زیب النساء	انتظام اللہ شہابی	مرتضیٰ پریس، دہلی
۲۸۔	مقالاتِ شبلی	مولانا شبلی	اعظم گڑھ
۲۹۔	تاریخی مقالات	خلیق احمد نظامی	ندوۃ المصنفین، دہلی
۳۰۔	سوانح دہلی	شہزادہ احمد مرزا	افتخار پریس، دہلی
۳۱۔	قیصر التواریخ اودھ	سید کمال الدین احمد	نول کشور پریس لکھنؤ
۳۲۔	تاریخ دہلی	کپور چندر پرکاش چند پبلشرز	سمتی پریس، دہلی
۳۳۔	ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں	محمد میاں مولانا سید	یونین پریس دہلی
۳۴۔	بیگماتِ اودھ	تصدق حسین شیخ	سرفراز پریس لکھنؤ
۳۵۔	دہلی تاریخ کے آئینہ میں	خلیق احمد نظامی	یونیورسٹی پریس، دہلی
۳۶۔	رانیاں اور شہزادیاں	خان احمد حسین خاں	ایجوکیشن پریس، لاہور

۳۷۔	مطلع الانوار	خواجہ امیر خسرو	مطبع مسلم یونیورسٹی
۳۸۔	دیول رانی خضر خاں	خواجہ امیر خسرو	مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ
۳۹۔	تاریخ داؤدی	عبداللہ	بہ تصیح پروفیسر شیخ عبدالرشید علی گڑھ
۴۰۔	منتخب التواریخ	ملا عبدالقادر، بدایونی	ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ
۴۱۔	آئین اکبری	ابوالفضل	مرتبہ سید احمد خاں دہلی
۴۲۔	آداب الحرب	فخر مدبر	قلمی نسخہ
۴۳۔	طبقات ناصری	منہاج الدین سراج	ایشیاٹک سوسائٹی
۴۴۔	تاریخ فرشتہ	محمد قاسم	نول کشور
۴۵۔	تاریخ فیروز شاہی	ضیاء الدین برنی	ایشیاٹک سوسائٹی
۴۶۔	اعجاز خسروی	خواجہ امیر خسرو	مطبع نول کشور
۴۷۔	اکبر نامہ	ابوالفضل	ایشیاٹک سوسائٹی
۴۸۔	قرآن السعدین	خواجہ امیر خسرو	مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ
۴۹۔	تاریخ مبارک شاہی	یحییٰ بن احمد سرہندی	ایشیاٹک سوسائٹی
۵۰۔	بابر نامہ	بابر	انگریزی ترجمہ مسز بیورج لندن
۵۱۔	خزائن الفتوح	امیر خسرو	علی گڑھ پرنٹنگ پریس
۵۲۔	مونس الارواح	جہاں آرا بیگم	قلمی نسخہ
۵۳۔	ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں	کنور محمد اشرف	ترجمہ: ترقی اردو بورڈ نئی دہلی
۵۴۔	جہاں آرا بیگم	ضیاء الدین احمد برنی	تعلیمی مرکز، کراچی
۵۵۔	گلبدن بیگم	پروفیسر سید ابن حسن شارق	دفتر خاتونِ مشرق، دہلی

مصنّف

کی

تاریخی صداقتوں پر مبنی تحقیقی تصانیف

* ——————— عہدِ وسطیٰ میں مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی
* ——————— داراشکوہ
* ——————— جنرل بخت خاں
* ——————— مغل شہزادیاں
* ——————— عظمتِ ہندوستان اور عہدِ وسطیٰ

——————— (زیرِ طباعت)

ملنے کا پتہ

محمودیہ پبلک اسکول، چوہان بانگر، نیو سیلم پور دہلی